کلیاتِ
اِقبال ساجِد
مرتّب
جواز جعفری

اقبال ساجد جدید غزل گو کہلانے پر بضد رہتا تھا اور اپنے سے زیادہ عمر کے شعراء کی شاعری کو دورِ جدید کے تقاضوں کے حوالے سے غیر ضروری بلکہ بے معنی قرار دیتا تھا۔ دوسری بات کی صحت پر بحث ہو سکتی ہے مگر جہاں تک خود اپنے بارے میں اقبال ساجد کے ادّعا کا تعلق ہے' وہ کم و بیش صداقت پر مبنی تھا۔ اس کی غزل کے موضوعات' اس کی منفرد لفظیات' اور اس کا خاص اپنا لہجہ اس کے ثبوت ہیں۔ بے شک اس کے کلام میں جارحیت اور تلخی کے عناصر زیادہ ہیں مگر یہ عناصر غزل کے لئے ممنوع نہیں ہیں۔ آخر یگانہ اور شاد عارفی کا کلام بھی تو اسی تلخ نوائی کا عکاس ہے مگر کس میں جرأت ہے کہ انہیں بیسویں صدی کے سربر آوردہ غزل گو شعراء کی صف میں سے خارج کرے۔ اقبال ساجد کی غزل نے نہایت ذہین نوجوان غزل گو شعراء کے ہجوم میں اپنی الگ پہچان کو تسلیم کرا لیا تھا اور اس کا سب سے سچا گواہ اس کا کلام ہے۔

جواز جعفری ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے اقبال ساجد کے کلام کو یکجا کر کے ضائع ہونے سے بچا لیا۔

احمد ندیم قاسمی

اقبال ساجد جدید اردو غزل کے شعراء میں ایک اہم نام ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کی معاشی اور معاشرتی ابتری کا اثر ایک حسّاس شاعر پر کس طرح اور کس انداز سے ہوتا ہے' اقبال ساجد کا کلام اس کی دردناک مثال ہے۔ اپنے آپ پر طنز' اس ماحول میں گندی سیاست سے بڑے بنے ہوئے اہلِ دانش و شعر پر زہر میں بجھے ہوئے اشعار کی معرفت غم و غصے کا اظہار' کہیں کہیں خود رحمی' کہیں کہیں زخمی انا کی مدافعت' کبھی کبھی خود کو غلط کثرت سے سمجھوتہ کر لینے کی تلقین۔ یہی اقبال ساجد کی شاعری کا حاصل ہے۔ یعنی ایک بگڑے ہوئے نظامِ حیات میں شرفِ انسانی کی بقا کی شاعرانہ خواہش کا بیان۔

اقبال ساجد کے کلام کو یکجا کرنے اور اسے ہمعصر دنیا میں اہمیت دلانے میں ہمارے دوست جواز جعفری نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ جواز جعفری نہ ہوتے تو اس اہم شاعر کا بہت سا کلام اور شخصیت کے بہت سے گوشے ادب پڑھنے والوں کی نظر سے اوجھل رہ جاتے۔

منیر نیازی

.... ساجد کی غزل' جدید غزل سے پوری طرح مربوط ہوتے ہوئے بھی اپنی الگ پہچان رکھتی ہے۔ کاش اقبال ساجد کو اتنا وقت مل جاتا کہ وہ اسے اور وسعت دے سکتا۔ اس کے کلام کا کچھ حصہ بڑی حد تک بہتر ہو سکتا ہے۔ کچھ تو ایسا بھی ہے جو دوسروں کے نام پر پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ جواز جعفری مبارک باد کے مستحق ہیں جنہوں نے اقبال ساجد کے مجموعے "اثاثہ" کے بعد ورق ورق اکٹھا کر کے ان کی کلیات شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اقبال ساجد کی پہچان اس حد تک ممکن ہو جائے گی جتنی کہ موجودہ حالات میں ممکن ہے۔

شہزاد احمد

اقبال ساجد کا شمار ہمارے عہد کے اہم ترین غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ خدا جانے اقبال ساجد کے ذکر کے بعد میرے ذہن میں یگانہ چنگیزی کا نام کیوں آتا ہے؟ شاید اس لئے کہ دونوں میں انانیت بڑی تھی اور دونوں اپنے بلند بانگ ادبی دعووں کی وجہ سے اس مقام سے بھی محروم رہے جو ان کا حق تھا۔ اقبال ساجد کے ساتھ ایک بدقسمتی یہ بھی تھی کہ اس نے تمام عمر شاعری کے علاوہ کچھ نہیں کیا حتیٰ کہ کبھی ڈھنگ کی گفتگو بھی نہیں کی۔ وہ اپنی شاعری میں جن خوبصورت خیالوں میں مگن نظر آتا ہے ان کا پرتو کبھی اس کی شخصیت سے ظاہر نہیں ہوا۔ چنانچہ مجھے آج تک سمجھ نہیں آسکی کہ وہ اتنی اعلیٰ درجے کی شاعری کیسے کرتا تھا۔ شاید اسی لئے اہل یونان شاعری کو دیوتاؤں کا انعام سمجھتے تھے۔

جواز جعفری ہم سب کے دلی شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک ایسے بے نوا لیکن باکمال شاعر کا کلام شب و روز محنت کے نتیجے میں یکجا کیا جسے میرے نزدیک نقادوں کے تمام گروپوں نے مکمل طور پر نظرانداز کیا۔ ان حالات میں ساجد کی کلیات کا مرتب کر کے شائع کرنا جواز جعفری کی طرف سے ایک ادبی خوشخبری کی ذیل میں آتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی

کُلیاتِ اقبال ساجد

مرتّب

جواز جعفری

اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ

ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کے لئے

خوبصورت اور معیاری مطبوعات

ناشر — میر شکیل الرحمٰن

اشاعت اول — اگست 1994ء

قیمت — 175 روپے

زیر اہتمام و ادارت — مظفر محمد علی

پبلشر — جنگ پبلشرز
(جنگ انٹرپرائزز لمیٹڈ کا ذیلی ادارہ)

پرنٹر — جنگ پبلشرز پریس
13۔ سر آغا خان روڈ لاہور

انتساب

اپنی ماتا جی (عنایت بیگم مرحومہ)

اور

پتا جی (صادق حسین جعفری)

کے لئے

فہرست

اقبال ساجد ایک ناراض خُوشاعر

اقبال ساجد مرحوم کا شعری مجموعہ ''اثاثہ'' اشاعت کے بعد اردو ادب کے قارئین کی طرف سے بے پناہ داد و تحسین حاصل کر چکا ہے اور اب ''کلیاتِ اقبال ساجد'' آپ کے سامنے ہے وہ تمام غلطیاں اور خامیاں جو ''اثاثہ'' میں رہ گئی تھیں کلیات میں حتی المقدر انہیں دُور کرنے کی کوشش کی گئی ہے نیز ''اثاثہ'' میں شامل غزلوں کے علاوہ بہت سی نئی غزلیں بھی شامل اشاعت کی جا رہی ہیں۔ تازہ غزلوں میں بعض تخلیقات ایسی ہیں جو ساجد کی دوسری چیزوں کی طرح اوّل درجے کی نہیں ہیں لیکن میں نے محض اس لئے انہیں کلیات میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا کہ اوّل تو کسی بھی بڑے سے بڑے ادیب کی ساری تخلیقات ایک جیسی نہیں ہوتیں اور ثانیاً کلیات کا مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ کسی شاعر نے زندگی میں جتنا کچھ کہا ہے اسے یکجا کر کے قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ ممکن ہے ساجد زندہ ہوتا تو اپنی ان تخلیقات کو کلیات میں شامل نہ کرنے کا فیصلہ کرتا مگر میرے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ ہم کلیاتِ اقبال ساجد ترتیب دیتے ہوئے ان تخلیقات کو اپنی پسند و ناپسند کی وجہ سے کلیات سے باہر رکھیں۔ اقبال ساجد کی کلیات میں چند ایسی غزلیں بھی شامل کی جا رہی ہیں جنہیں بڑے بڑے عہدوں پر فائز خواتین و حضرات نے اس کی معاشی مجبوریوں کی آڑ میں .... محض سو پچاس روپوں یا ایک ''کپُی'' کے عوض خرید لیا۔ میں ان ''بکی'' ہوئی تخلیقات کو محض اس لئے شامل اشاعت کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک یہ ساجد ہی کی غزلیں ہیں لہٰذا انہیں ساجد کی کلیات میں شامل کیا جانا چاہئے۔ رہا خریداروں کا موقف تو میرے خیال میں ان لوگوں کو اب ساجد کی

غزلوں سے رضا کارانہ طور پر دستبردار ہو جانا چاہئے کیونکہ یہ خواتین و حضرات ساجد کی غزلوں کے بل بوتے پر ملکی و غیر ملکی مشاعروں سے ہزاروں روپے اور شہرت کما چکے ہیں۔

اقبال ساجد کے اوّلین شعری مجموعے "اثاثہ" کی اشاعت کے بعد دو طرح کے ردِّ عمل سامنے آئے۔ ایک ردِّ عمل تو ان لوگوں کا تھا جو نہ صرف ادب نواز ہیں بلکہ ساجد مرحوم کے چاہنے والے بھی ہیں لہٰذا ان کے لئے "اثاثہ" کی اشاعت ایک ادبی و روحانی مسرّت سے کم نہ تھی۔

دوسری قسم کے لوگ وہ تھے جن کے ہاں "اثاثہ" کے مارکیٹ میں آتے ہی صفِ ماتم بچھ گئی کیونکہ اس اقبال ساجد کو جسے وہ قسطوں میں موت کی نیند سلانے کے بعد' منوں مٹی کے نیچے دبا کر اس کے شعری اثاثے کی سیڑھی پر کھڑے ہو کر اپنے بونے قدوں کو اونچا کرنے کے ارادے کر ہی رہے تھے کہ "اثاثہ" کے ذریعے میں نے ساجد کو منوں مٹی کے نیچے سے نکال کر ایک بار پھر ان لوگوں کے سامنے لا کھڑا کیا اور وہ ان "متشاعر" خواتین و حضرات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے طنزیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

موم کی سیڑھی پہ چڑھ کر چھو رہے تھے آفتاب
پھول سے چہروں کو یہ کوشش بہت مہنگی پڑی

ان لوگوں کے غیر ادبی ہتھکنڈوں کے نتیجے میں ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ "اثاثہ" پر جس ادیب نے بھی قلم اٹھایا وہ ساجد کی شاعری کی خرید و فروخت والی بحث میں الجھ کر رہ گیا لہٰذا بات اس قصّے سے آگے نہ بڑھ پائی۔ ہمارے ایک آدھ نقّاد کے سوا کسی نے بھی ساجد کے فن کی نئی اور پوشیدہ سطحوں' جہتوں اور رُخوں کو چھونے کی کوشش ہی نہیں کی۔

ساجد کی شاعری کے خرید و فروخت والے رُخ پر بہت زیادہ زور دینے سے اس کے فن پر پوری طرح بحث نہیں ہو سکی لہٰذا ہمارے ناقدین کو اس زیادتی کی تلافی کرتے ہوئے اس طرف بھرپور توجہ دینی چاہئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں خرید و فروخت کے نتیجے میں پھیلنے والے ادبی استحصال کو روکنے کے لئے بھی اپنا کردار ادا کرنا ہو گا۔

یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ ادب تعصّبات کا اسیر نہیں ہوتا بلکہ سچا ادب حسن' خیر اور صداقت کا علمبردار ہوتا ہے لہٰذا ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ "اثاثہ" کے دیباچے میں مَیں نے جن جن شعراء و شاعرات کی جعلی شہرت کا بھانڈا سرِ بازار پھوڑا تھا' یہ سب کچھ میں نے کسی ذاتی رنجش' ناپسندیدگی یا دشمنی کے تحت نہیں بلکہ سچ کی فتح کے لئے کیا اور آئندہ بھی ایسے جعلی اور نام نہاد اہلِ قلم کو بے نقاب کرتا رہوں گا جو ساجد مرحوم کے لفظوں سے اپنی اپنی "دکانیں" سجائے اور کاروبار چمکائے بیٹھے ہیں۔ انہی کے لئے ساجد نے کہا تھا!

میرا پیراہن پہن کر لوگ شہرت پا گئے
میں تو ننگا ہو گیا' اپنا نیا پن بیچ کر

"اثاثہ" کی اشاعت کے بعد ایک بڑی عجیب وغریب بات دیکھنے میں آئی کہ جب میں نے اپنے مقالے میں پہلی مرتبہ ادبی استحصال کے خلاف احتجاجی آواز بلند کی تو ملک کے طول وعرض میں بسنے والے ہزاروں نوجوان اہل قلم نے نہ صرف میری آواز پر لبیک کہا بلکہ میری آواز کو اپنی تائیدی صداؤں سے اتنا مضبوط اور بلند کر دیا کہ کہ ساجد کے خریداروں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔

جبکہ اس سلسلے میں نام نہاد بزرگ ادیبوں کا رویہ (چند ایک کو چھوڑ کر) نہایت سرد بلکہ نہایت منافقانہ رہا اور یہ اہل قلم اپنے اپنے "تکیوں" اور ادبی "خانقاہوں" میں ہونٹوں پر مجرمانہ خاموشی کی مہریں لگائے بیٹھے رہے حالانکہ یہ جنگ کسی خاص فرد یا گروہ کے خلاف نہیں بلکہ ایک استحصالی رویے کے خلاف تھی اور اب تک جاری ہے۔ جس کا شکار کوئی بھی اہل قلم ہو سکتا ہے بہر حال میں ان تمام اہل قلم کا شکر گزار ہوں جنہوں نے سچ کی سربلندی کے لئے میرے موقف کی تائید کی۔ مجھے فخر ہے اہلِ قلم کی نئی نسل پر جو خوشامد، گروہ بندی اور تعصّبات سے اوپر اٹھ کر سچ سنتی اور سچ کا اظہار کرتی ہے۔

اقبال ساجد ایک عجیب وغریب انسان تھا اس کی زندگی محرومیوں اور تضادات کا مجموعہ تھی مثال کے طور پر اس کی ذات میں پائے جانے والے اس تضاد پر لوگ سخت حیران ہیں کہ اتنا اچھا شاعر اتنا بُرا انسان کیوں تھا؟ اس قسم کے سوالات کا جواب دینے کے لئے ہمیں اس کے ارد گرد کے ماحول اور اس کی ذات کا سماجی، اخلاقی اور نفسیاتی مطالعہ کرنا ہوگا۔ کیونکہ کسی بھی فنکار کے فن کو اس کے مخصوص سماجی، ماحول میں رکھ کر ہی بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ ساجد کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بنیادی طور پر وہ ایک ناراض خُو انسان اور فنکار تھا۔ یہ ناراض خُوئی بیک وقت سسٹم، اپنی برادری کے تخلیق کاروں اور خود اپنی ذات کے ساتھ بھی ہے۔ ناراض خُوئی کی یہ لہر اگرچہ بیسویں صدی کے اوائل ہی سے دنیا بھر میں محسوس کی جانے لگی تھی لیکن دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں مغرب میں لوگوں نے سٹرکچر کے خلاف سخت ردعمل کا اظہار کیا اور سٹرکچر یا اتھارٹی کے مقابلے میں جمہوریت، آزادی اور مساوات کے نعرے لگائے اور سٹرکچر کے ساتھ انسان کے کردار کو نئے سرے سے متعین کرنے کی باتیں شروع ہوئیں۔

چنانچہ لوگوں میں وجودیت، انفرادیت پسندی" ہپّی ازم، انارکزم اور مارکسزم جیسے نظریات کی بڑھتی ہوئی مقبولیت بڑی حد تک اتھارٹی کے خلاف فرد کے غم وغصے ہی کو ظاہر کرتی ہے، ان تمام رجحانات کے پیچھے ایک ہی خواہش کار فرما تھی کہ فرد کو زیادہ سے زیادہ آزاد ہونا چاہئے۔ چنانچہ عالمی لٹریچر کے حوالے سے ژاں پال سارتر، ہرمن ہیس، ایمی سیزار، پابلو نرودا، کافکا اور اردو میں ساحر لدھیانوی منٹو، عصمت، حبیب جالب اور اقبال ساجد فرد کے مذکورہ رجحانات کے نمائندہ ادیب وشاعر ہیں۔

ہمارے ہاں آج تک سٹرکچر یا اتھارٹی فرد کے مقابلے میں ضرورت سے زیادہ مضبوط ہے، ایک علاقہ دوسرے کا استحصال کرتا ہے جبکہ ایک سازش کے ذریعے تقسیم کے وقت ملک میں مساواتی بنیادوں پر سوسائٹی کی تشکیل کرنے کے بجائے نئے ملک میں وہی پرانی طبقاتی تقسیم روا رکھی گئی مخصوص طبقے کا کنٹرول، کلچرل شناخت میں ناکامی، ہجرت اور اس سے

وابستہ آئیڈیل ازم کی ٹوٹ پھوٹ' جمہوری اداروں کے مقابلے میں بیورو کریسی کی مضبوطی' میڈیا پر ریاستی کنٹرول' اور مذہبی' لسانی اور جغرافیائی حوالے سے اٹھنے والی تشدد کی لہریں ہمارے ہاں فرد کو دن بدن کمزور و بے بس اور سسٹم کو مزید مستحکم کر رہی ہیں۔ چنانچہ ایسی سوسائٹی جس کی بنیاد توہین پر رکھی گئی ہو۔ جہاں کمیونیکیشن کا فقدان ہو' جہاں ایک طبقہ دوسرے طبقہ کا استحصال کرے۔ جہاں دوسروں کا گلہ دبانے اور "کہنی" مار کر آگے نکلنے والوں کو کامیاب انسان گردانا جاتا ہو' جس کی اقتصادیات کی بنیاد ڈاکوازم پر رکھی گئی ہو' ساجد کے لئے دو ہی راستے تھے یا تو وہ انسان دشمن سسٹم سے سمجھوتہ کر کے لوٹ مار میں شامل ہو جائے بصورت دیگر ایک ایسا سسٹم جو انسانی امنگوں اور آرزوؤں پر پورا نہیں اترتا' اس کے خلاف اعلان جنگ کر دے چنانچہ اس نے اپنے لئے دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔ اس نے "سٹیٹس کو" کے خلاف آواز بلند کی جس کے نتیجے میں ہماری کئی نسلیں ڈپریشن اور فرسٹریشن کا شکار ہوئیں۔ ان نسلوں پر جب آگے بڑھنے کے مواقع اور راستے بند کئے گئے تو وہ "اداس" یا پھر "ناراض" ہو کر تاریک راستوں پر چل دیں۔ اقبال ساجد انہی لوگوں میں سے ابھر کر سامنے آیا تھا لہٰذا وہ اس پورے سسٹم کے خلاف سراپا احتجاج بن گیا جو آرزوؤں سے بھرے ہوئے دلوں کو بے رحمی سے کچل ڈالتا ہے۔

بتا اس دور میں اقبال ساجد کون نکلے گا؟
صداقت کا علم لے کر اگر تو بھی نہیں نکلا

ساجد یہ جنگ ایک ایسی زر پرست سوسائٹی میں تنہا لڑ رہا تھا جہاں تخلیق اور تخلیق کار کو تیسرے درجے کی چیز سمجھا جاتا ہے جہاں چیزوں حتی کہ رشتوں کو بھی روپے کے معیار سے ناپا جاتا ہے لہٰذا جس کے پاس جتنا سرمایہ ہے اس کے پاس اتنا بڑا سچ ہے ہاں البتہ اس ماحول میں اگر کوئی شخص جھوٹا ہے تو وہ فنکار ہے۔

جب ہوئی رائے شماری سبھی صادق ٹھہرے
ایک ہم تھے کہ جو بستی میں منافق ٹھہرے

یہ ایک ایسی "بستی" ہے جہاں محبت' نفرت' لمس' حسن' حرارت' شہرت' پھول سے بدن' قرب اور ضمیر سب کچھ روپے کے زور پر میسّر آسکتا ہے۔

صاحب اگر ہیں آپ تو سب آپکے غلام
ہر شے ملے گی حسبِ ضرورت کرائے پر

ساجد اس استحصالی سسٹم اور اس سے وابستہ اداروں اور افراد کے چہروں سے نقاب کھینچتا ہے جو خود تو کبھی کوئی کام نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی محنت پر عیش کرتے ہیں جو تخلیق کار نہیں محض کنٹرولر ہیں۔ چنانچہ جب ساجد ایک طبقے کی محنت پر دوسرے طبقے کو عیاشی کرتے دیکھتا ہے تو وہ اس ظلم پر چپ نہیں رہ سکتا۔

ستم تو یہ ہے وہ فرہادِ وقت ہے جس نے
نہ جوئے شیر نکالی نہ بُت تراش ہوا

ٹھہرے ہیں زر و سیم کے حقدار تماشائی
اور مارِ سیہ ہم نے دفینے سے نکالا

چنانچہ ایک ایسا سسٹم...... جو پوری تیسری دنیا پر مسلط کر دیا گیا ہے جو نظام انسانی امنگوں کا دشمن ہو' جو انسان کی آزادی' مساوات' عزتِ نفس' انصاف اور محبت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہو ساجد سے ملیامیٹ کر دینے کی بات کرتا ہے۔

پہنائے وسعتوں کو نیا دائرہ کوئی
اس چرخ کو نظامِ کہن سے نکال دے

وہ ایک ایسی "بستی" کی تصویریں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جہاں شاعر سمیت لوگ بھوک پہنتے اور پیاس اوڑھتے ہیں' آنگنوں میں فاقے بچھائے جاتے ہیں اور غربت کی تیز آگ پر بھوک پکائی جاتی ہے' انسان تبرک کے لئے مزاروں پر چھینا جھپٹی کر رہے ہیں' جہاں انسان جانور کی کھال پہن کر پنجوں کے بل چلتا ہے' جہاں دوسروں کے جرم اپنے نام لکھوانا پڑتے ہیں' محض روٹی کے لئے انسان جیل کو ترجیح دیتا ہے' گھر کے دروازے پر دستک دینے والے مہمانوں کو بچوں کے ذریعے واپس لوٹا دیا جاتا ہے' جہاں سانسوں کی آمد و رفت کے تسلسل کے لئے انسان ہسپتالوں میں اپنے خون کا بیوپار کرتے ہیں اور قدم قدم پر عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے۔ ایسے میں شاعر ایک لمحے کے لئے سوچتا ہے کہ کیوں نہ ظالموں کی پیشکش کو قبول کرتے ہوئے وہ بھی ظالمانہ سسٹم کے خلاف جنگ سے دستبردار ہو کر' ان کے ساتھ مل جائے اور ایک خوبصورت اور آسودہ زندگی کا آغاز کرے۔

ظالموں کے ساتھ مل جاؤ رہو گے عیش میں
عمر ساجد کسمپرسی میں بسر کرتے ہو کیوں؟

لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سمجھوتوں پر آمادہ کرنے والے خیال کو ذہن سے جھٹک دیتا ہے اور اپنے احتجاج کو جاری رکھنے کا فیصلہ کرتا ہے جو اس کی شناخت ہے چنانچہ وہ اس جنگ میں ثابت قدمی اور مدد کے لئے صرف اپنے خدا کی تائید و حمایت کا طالب ہے۔

یا رب نہ کبھی میرے اصولوں میں لچک آئے
جب جنگ چھڑے تیری ہی جانب سے کمک آئے

کرپٹ سسٹم کے خلاف جنگ' شاعر قلم کے ذریعے جیتنا چاہتا ہے لیکن جب وہ اپنے ارد گرد قلم کے نام پر ہونے والی کرپشن دیکھتا ہے تو اسے ایک مزید محاذ ان نام نہاد اہلِ قلم کے خلاف بھی کھولنا پڑتا ہے جو خود تو لفظ تخلیق نہیں کر سکتے البتہ اپنی دولت کے بل پر لفظوں کو خرید کر چور دروازوں سے ادب میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ساجد انہی لوگوں پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے!

پیسہ ہے تیرے پاس تو کچھ نام بھی کما
لے آ کسی غریب سے شہرت کرائے پر

بابِ سخن میں اب وہی مشہور ہو گئے
وہ جن کے ذہن سے کوئی کاوش نہیں ہوئی

جس طرح باقی زندگی میں غیر مستحق لوگ مختلف شعبوں پر چھائے ہوئے تھے اسی طرح دیکھتے ہی دیکھتے بعض بڑے محکموں کے افسران اور ان کی بیگمات اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں کی زینت بننے لگے۔ ٹی وی اور ریڈیو سے نشر ہونے والے مشاعروں اور ادبی پروگرام پر ان کا قبضہ ہوتا گیا اور ایسے غیر تخلیقی لوگ اپنی دولت کے زور پر شہرت سمیٹنے لگے۔ ایک سچے تخلیق کار کی حیثیت سے یہ ساری صورتحال ساجد کے لئے بڑی تکلیف کا باعث تھی۔ وہ ساری زندگی میڈیا اور ادبی اداروں کے کردار سے نامطمئن رہا۔ جب وہ دیکھتا کہ میڈیا حقیقی اہل قلم کے بجائے بوگس ادیبوں کو پروجیکٹ کر رہا ہے اور ادیبوں کی فلاح و بہبود کے ادارے مستحق اہل قلم کے بجائے جعلی ادیبوں پر اپنی گرانٹس خرچ کر رہے ہیں اور یہ نام نہاد ادیب ان اداروں کے خرچے پر دنیا بھر کے تفریحی سفر کرتے ہیں اور بڑے بڑے وظائف حاصل کرتے ہیں تو ایسے میں ساجد ان اداروں کے غیر ادبی کردار کو دیکھ کر ان کے پالتو ادیبوں پر طنز کرتا ہے۔

ٹوٹیں گی جب طنابیں رہ جائیں گے سُکڑ کے
کھینچ کر بڑے ہوئے ہیں یہ آدمی ربڑ کے
ٹانگوں سے بانس باندھے شوقِ قد آوری میں
بونے بھی راستوں پر چلنے لگے اکڑ کے

اب تک کی ساری جنگ اور احتجاج میں شاعر نے خود کو ہر طرح کی کرپشن سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن زندگی میں کسی قسم کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہونے اور زندگی کی چھوٹی بڑی ضروریات کے حصول' بیوی بچوں کی کفالت' شراب کی "کِٹی" کی فراہمی نیز سماجی زندگی کے تلخ حقائق کے دباؤ کے سامنے وہ اپنے آپ کو کرپشن سے نہ بچا سکا اور اس نے سستے داموں غیر تخلیقی خواتین و حضرات کے ہاتھوں اپنی غزلیں بیچنی شروع کیں۔

شعر و سخن کی دنیا میں اک مدت سے
نئے نئے تیار کھلاڑی کرتا ہوں

....

کچھ شعوری سطح پر' کچھ لاشعوری طور پر
کار فکر و فن میں اب سب کی مدد کرتا ہوں میں

اس بارے میں قطعاً دو آراء نہیں ہیں کہ وہ بہت سے خواتین و حضرات کے ہاتھوں اپنی غزلیں بیچتا تھا لیکن میرے نزدیک اگر کسی سے تخلیقات خرید کر اپنے نام سے چھپوانا یا ادبی محفلوں میں پڑھنا کرپشن ہے تو یقیناً وہ شخص بھی اس برائی میں برابر کا شریک ہے جو غیر تخلیقی لوگوں کو جعلی تخلیق کار بننے میں مدد دیتا ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف خود بیچنے والے شاعر بلکہ دیگر مستحق اہلِ قلم کے استحصال کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ساجد تضاد کا شکار ہو جاتا ہے یعنی وہ ایک غلط سسٹم کے خلاف آواز بھی بلند کر رہا ہے اور اس کا حصہ بھی بننے لگا ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ وہ کسی شخص کے پاس غزل بیچنے کے بعد کسی قسم کی رازداری کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا بلکہ دوسرے ہی لمحے پاس بیٹھے لوگوں کو ساری بات بتا دیتا تھا۔

وہ لوگ جو اس سے غزلیں خریدتے تھے۔ بعد ازاں جب انہیں ملکی و غیر ملکی شاعروں میں سنا کر ہزاروں روپے اور ڈھیر ساری شہرت سمیٹتے تو ساجد کو ایک طرح کا دکھ ہوتا کیونکہ ان غزلوں کا اصل تخلیق کار آسائشوں اور سہولتوں سے محروم زندگی بسر کر رہا تھا جبکہ خریدار انہی غزلوں کے ذریعے پیسے اور عزت کما رہے تھے شاید نفسیاتی حوالے سے یہی وہ مقام تھا جہاں وہ دوسروں کو اپنے خریداروں کے نام بتا کر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ دراصل ان غزلوں کا خالق میں ہوں اور ان لوگوں کی ساری عزت اور شہرت میرے ہی دم سے ہے۔

مفت میں تقسیم کی ساجد متاعِ شاعری
جس نے اپنی قرب اپنایا وہ شاعر ہو گیا

.....

میرا پیراہن پہن کر وہ شہرت پا گئے
میں تو ننگا ہو گیا اپنا نیا پن بیچ کر
عزتیں ان کو ملیں جو باعثِ عزت نہ تھے
ہم کہ رسوائی کا باعث بن گئے فن بیچ کر

دوسری طرف جو لوگ اس کی غزلیں خرید کر مشاعروں میں پڑھتے تو بعض اوقات ان کے ساتھ عجیب و غریب لطیفے پیش آتے مثلاً ایک مشاعرے میں جب ایک صاحب نے ساجد سے خریدی ہوئی غزل شروع کی تو جواباً بہت سے نوجوانوں نے موصوف کو داد دینے کی بجائے زور زور سے کہا "واہ اقبال ساجد واہ" کیونکہ ساجد کی غزل کے مضامین، لفظیات اور لہجہ ایسا تھا کہ لوگ فوراً پہچان لیتے تھے۔ اسی لئے تو وہ کہتا ہے۔

مرے اشعار ہی کر دیتے ہیں نیکی ظاہر
شعر کی بھیک جنہیں میں نے چھپا کر دی ہے
شکل اس کی تھی مگر تختی تھی میرے نام کی
چور ثابت کر دیا اس کو مرے اشعار نے

سنہری حرفوں کو مٹی کے بھاؤ بیچنے کے بعد، جب وہ اپنے خریداروں کو شہرت اور عزت کی زندگی بسر کرتے دیکھتا ہے تو اسے دکھ پہنچتا ہے او وہ اس تضاد پر حیران ہے کہ غیر تخلیقی لوگ اس کی لکھی ہوئی غزلوں کے باعث جانِ محفل بنے بیٹھے ہیں جبکہ وہ خود جب کسی محفل میں پہنچتا ہے تو لوگ عجیب طرح سے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں چنانچہ یہی وہ مقام ہے جہاں وہ اپنے فن کا سودا کرنے پر پچھتاوے کا اظہار کرتا ہے۔

کیا ملا اقبال ساجد جدّتِ فن بیچ کر
اب گزر اوقات کر دانتوں کا منجن بیچ کر

....

یہ ترے اشعار تیری معنوی اولاد ہیں
اپنے بچے بیچنا اقبال ساجد چھوڑ دے

دنیا کے لٹریچر میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جب اہلِ قلم نے سماجی جبر کے خلاف ناراضگی کا اظہار کیا لیکن سماج کے ایک رکن کی حیثیت سے انہوں نے ہمیشہ اچھے شہری ہونے کا ثبوت دیا نتیجتاً ان کی سماجی اور تخلیقی زندگی کی وحدت قائم رہی لیکن ساجد کا المیہ یہ ہے کہ اس نے سماج کے ممبر کی حیثیت سے سرے سے کبھی کوئی کام کیا ہی نہیں، وہ چیزوں پر بغیر محنت کئے اپنا حق جتاتا ہے اور یہ بات کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی معاشرے کا ذمہ دار شہری ہونے کا ثبوت نہ دے اور معاشرہ اسے تمام ضروریات و سہولیات فراہم کرے؟ لہٰذا معاشرے نے اسے رد کر دیا اور وہ لمحہ لمحہ ضروریاتِ زندگی کے لئے ترسنے لگا اور پھر اسی کے نتیجے میں اسے بہت سے ایسے کام کرنے پڑے جسے ہماری مروّجہ معاشرت و اخلاقیات کی نظر میں پسندیدہ نہیں کہا جاسکتا اور جب سوسائٹی کی طرف سے اسے نظر انداز کرنے کا رویّہ سامنے آیا تو اس کی انا کو زبردست ٹھیس لگی نتیجتاً اس نے ردّعمل کے طور پر سٹرکچر کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی اہم شخصیات کو بھی رد کرنا شروع کر دیا۔

فراقؔ و فیضؔ و ندیمؔ و فرازؔ کچھ بھی نہیں
نئے زمانے میں انکا جواز کچھ بھی نہیں

اس کو اپنے نظر انداز کئے جانے کا شدید صدمہ تھا لہٰذا اس نے ردعمل کے طور پر ایسے ایسے لوگوں کے خلاف ناراض خوئی کا اظہار کیا جو درحقیقت اس کے محسن تھے۔

ساجد کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ اس کے ہاں انانیت اور شاعرانہ تعلّی اس قدر زیادہ کیوں ہے۔ میرے خیال میں اس کی نفسیاتی وجہ شاید یہی ہو کہ اسے اپنی ناقدری کا شدید احساس تھا لہٰذا وہ خود کو تسلی دینے کے لئے اپنی زبانی اپنے بڑے شاعر ہونے کا اظہار کرتا ہے حالانکہ یہ بات غلط بھی نہیں۔

عہدِ جدید تر کا نمائندہ کون ہے؟
گر میں نہیں تو اور یہاں زندہ کون ہے؟

ہے تیرے سامنے ساجد مثال غالب کی
پرانی ہو نہیں سکتی نئی لکھائی دیکھ

....

زمانہ کہہ رہا ہے جب خدائے شاعری تم کو
ترے چہرے پہ سجتا ہے جلال وجاہ کا رہنا

....

لکھنے میں ادا فرضِ تعلّی بھی ہو ساجد
دنیائے ادب میں ترا سکہ ہے رواں لکھ

کبھی کبھی وہ ناقدری کے اس دکھ کو کم کرنے کے لئے کہتا ہے!

ہے جاہلوں کے سامنے تخلیق کا زیاں
رکھوں نمائشوں میں ہنر کس کے واسطے

فائز کریں گے لوگ مجھے منصبوں پہ کیا
میں نے تو خود مقام دیا ہے سماج کو

سماجی زندگی میں ناکام ہونے کے بعد اسے بہت سی ذہنی ' جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں نے گھیر لیا۔ ہر سے شکست تو اسے ہو چکی تھی لہٰذا اب اس نے اندر سے بھی ہار مان لی اور معاشرے اور غیر تخلیقی ادیبوں کی طرف سے ہونے والی زیادتیوں کا بدلہ وہ اپنی ہی ذات سے لینے لگا۔ چنانچہ بیگانگی ' شراب نوشی ' چھوٹی موٹی چوریاں ' دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا ' جھوٹ بولنا ' دوسروں کی توہین کرنا ان سب برائیوں کی آڑ میں دراصل وہ اپنی ہی ذات سے انتقام لے رہا تھا۔

اب اس کی ناراض خُوئی یا احتجاج کا تیسرا رخ اس کی اپنی ہی شخصیت کی طرف مڑ گیا تھا اور وہ ہر بات کا بدلہ اپنے آپ سے لینا چاہتا تھا۔

میں خود سے لڑائی میں ہوں مصروف شب و روز
کیا جانیے کیوں ختم تصادم نہیں کرتا

وہ جو کبھی دوسروں کو چھاؤں بخش کر خود دھوپ میں جلتا تھا اب دوسروں کو اذیت پہنچا کر خوش ہونے لگا۔

اپنی انا کی آج بھی تسکین ہم نے کی
جی بھر کے اس کے حسن کی توہین ہم نے کی
لہجے کی تیز دھار سے زخمی کیا اسے
پیوست دل میں لفظ کی سنگین ہم نے کی

تسکین کی ایک صورت تو دوسروں کو اذیت پہنچانے کے حوالے سے سامنے آتی ہے جبکہ ایک صورت ایذا طلبی ہے' ساجد کہتا ہے۔

دہائی دوں کہ کھلے ظلم سے بچائے مجھے
کوئی تو ہو مرے پنجے سے جو چھڑائے مجھے
مرے ہی منہ کو مرا خون لگ چکا ہے یہاں
مرے سوا کوئی قاتل نظر نہ آئے مجھے
میں اپنے جسم کی بوری کو ٹھوکریں ماروں
مگر یہ شغلِ اذیت پسند آئے مجھے

آخری عمر میں مایوسیوں محرومیوں اور بیماریوں نے اس کے نحیف جسم میں پنجے گاڑ لئے تھے اور وہ کچھوے کی طرح اپنی ذات کے اندر سمٹنے لگا تھا۔ وہ شاعر جو کبھی سسٹم سے الجھتا تھا اب خارجی قوتوں سے برسرِ پیکار ہونے کے بجائے اپنی ذات کے اندر پناہ ڈھونڈنے لگا۔

مُوند کر آنکھیں تلاشِ بحروبر کرنے لگے
لوگ اپنی ذات کے اندر سفر کرنے لگے

ذات کی محرومیوں ناکامیوں اور معاشرے کی طرف سے رد کئے جانے کے باعث وہ اپنے "اندر" اُترنے لگا۔ اپنی محرومیوں کا ذکر یوں کرتا ہے۔

ہاتھوں پہ بہہ رہی ہے لکیروں کی آب جُو
قسمت کا کھیت پھر بھی ہے بنجر پڑا ہوا

....

غربت کی تیز آگ پہ اکثر پکائی بھوک
خوشحالیوں کے شہر میں کیا کچھ نہیں کیا

یہی وہ مقام ہے جہاں دیگر عوارض کے ساتھ ساتھ وہ شدید قسم کے احساسِ تنہائی میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ اپنے ہی گھر میں پڑا قیدِ تنہائی کاٹ رہا ہے' وہ دوستوں کی محفل میں تنہا ہے۔ اس کے گھر کا رابطہ آس پاس کے گھروں سے کٹ گیا ہے اس احساسِ تنہائی کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن میرے نزدیک اس کی بنیادی وجہ وہی ہے جو کارل مارکس نے بیان کی ہے کہ

سرمایہ دار سوسائٹی میں دولت مند' محنت کش سے اس کی محنت خرید لیتا ہے اور اس کی محنت کے بدلے میں اسے جو معاوضہ دیا جاتا ہے وہ نہایت قلیل ہوتا ہے لہٰذا محنت کش کام میں خوشی محسوس کرنے کے بجائے الٹا اکتاہٹ کا اظہار کرنے لگتا ہے۔

مشینیں آہستہ آہستہ اس کے جسم سے اس کی قوت نچوڑ لیتی ہیں اور پھر جو چیزیں محنت کش تیار

کرتا ہے وہی چیزیں اس کی اپنی زندگی میں شامل نہیں ہو پاتیں۔ مثلاً وہ کار تیار کرتا ہے مگر خود پیدل سفر کرتا ہے۔ فریج بناتا ہے مگر خود گرم پانی پیتا ہے لہٰذا اپنی ہی تیار کردہ چیزیں اس کے سامنے حریف بن کر کھڑی ہوتی ہیں جس کی بناء پر محنت کش اپنی تخلیق کو دیکھ کر خوشی محسوس کرنے کے بجائے الٹا نفرت کا اظہار کرتا ہے ویسے بھی مشینوں کے ساتھ کام کرتے کرتے وہ خود بھی مشین بن جاتا ہے کیونکہ مشینوں کے احساسات و جذبات نہیں ہوتے۔ اس تجربے کے باعث محنت کش آہستہ آہستہ اپنی محنت 'اپنی تخلیقات' اپنے ماحول 'گھر' رشتوں حتیٰ کہ اپنی ذات ہی سے بیگانہ ہوتا چلا جاتا ہے وہ لوگوں سے بھرے شہر میں خود کو اکیلا محسوس کرتا ہے یہ احساس تنہائی اسے کہیں چین نہیں لینے دیتا۔

ساجد کے ساتھ بھی یہی ہوا ایک تو کراچی اور لاہور جیسے صنعتی شہروں کی فضا میں رہنے کے باعث اور پھر اپنی محنت کی بنیاد پر دوسروں کو عزت و شہرت کے مقام پر فائز دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ اپنے اندر سمٹنے لگا اور پھر مکمل طور پر ہر طرف سے کٹ گیا۔ نیز بہت سی نفسیاتی بیماریوں نے بھی اسے لوگوں کے ہجوم سے الگ کر دیا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے

ایسے گھر میں رہ رہا ہوں دیکھ لے بے شک کوئی
جس کے دروازے کی قسمت میں نہیں دستک کوئی

کیا جانیے کیا بات ہے، اک عمر سے ساجد
ویران ہے ٹوٹے ہوئے مرقد سے زیادہ

جانے رہتا ہے کہاں اقبال ساجد ان دنوں
رات دن رہتا ہے اس کے گھر کا دروازہ لگا

چل پڑے تو ہو لئے اقبال ساجد اپنے ساتھ
رک گئے تو اپنے ہی سائے میں سستانے لگے

گھٹیا قسم کی شراب نوشی، مختلف قسم کی ذہنی و جسمانی بیماریوں کے رد عمل کے نتیجے میں اس نے اپنے لئے جس زندگی کا انتخاب کیا تھا وہ سراسر خودکشی کے مترادف تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بنیادی طور پر بزدل تھا ایک دم خود کو ختم کرنے کے بجائے قسطوں میں موت کو گلے لگاتا رہا۔ آخری عمر کے اشعار میرے اس نظریئے کی تائید کرتے ہیں۔

کیا سوچتا ہے، کاٹ رگ و پے کی رسیاں
اب خون کا عذاب بدن سے نکال دے

چلّۂ جاں پر چڑھا کر آخری سانسوں کے تیر
موت کی سرحد میں داخل زندگانی ہو گئی

میں آدھے جسم سے زندہ ہوں یہ بھی کیا کم ہے
الٰہی اور اضافہ نہ کر تباہی میں
....
کس نے اپنے ہاتھ سے خود موت کا کتبہ لکھا
کون اپنی قبر پہ عبرت کا پتھر ہو گیا

چنانچہ اقبال ساجد کی وہ ناراض خوئی اور احتجاج جو ایک ظالمانہ سسٹم اور استحصالی طبقوں کے خلاف شروع ہوا تھا بالآخر اس کی اپنی ذات اس کا شکار ہو گئی کیونکہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ ساری جدوجہد اور احتجاج کے بعد بھی سسٹم قائم رہے گا لہٰذا اس کا مزاج عجیب و غریب بن گیا وہ ہر چیز سے انکاری ہو گیا اس نے ہر چیز کو رد کر دیا۔ سسٹم، ادارے، شخصیات حتیٰ کہ اپنی ذات کی بھی نفی کر دی۔ اس نے مروّجہ اخلاقیات کو بھی رد کیا اور دوسری اخلاقیات کی اس کے دل میں کوئی خواہش نہیں رہی تھی لہٰذا اس نے چوری، جھوٹ، شراب نوشی اور ہر وہ کام کیا جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچائی جا سکتی تھی۔ اس نے ایک سسٹم کو رد کر دیا مگر دوسرا سسٹم دینے کی اس کی کوئی آرزو نہ تھی کیونکہ یہ ایک قسم کی اصلاح پسندی ہے اور وہ اصلاح پسندی سے مایوس ہو چکا تھا۔

اگر ہم فنی سطح پر ساجد کی ناراض خُوئی یا احتجاج کا جائزہ لیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ ساجد کی ناراضگی ایک ایسے بچے کی ناراضگی ہے جو محض اس لئے لڑتا ہے کہ اسے دوسروں کی نسبت کم حصہ ملا ہے۔ وہ سسٹم کے خلاف اپنی ناراض خُوئی کو کائناتی بنانے کے بجائے شخصیات اور ذاتیات پر اُتر آیا اور بالآخر اس کی اپنی ذات بھی اسی ناراض خُوئی کی نذر ہو گئی۔

فنّی حوالے سے بھی اس کا احتجاج اکہری سطح کا ہے، جس میں زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ایک سے زیادہ شیڈز سطحیں اور جہتیں نظر نہیں آتیں کیونکہ زمانے سے جنگ کے ساتھ ساتھ فنکار کو ایک جنگ اپنے خلاف بھی لڑنی پڑتی ہے اور اس تصادم کو ذاتی تجربے کے حوالے سے ایک خاص فنکاری اور تہہ داری کے ساتھ پیش کرنا ہی کمالِ فن ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ کسی حد تک درست ہے کہ ساجد اپنے احتجاج کو فنّی اعتبار سے گہرا اور تہہ دار بنانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو پایا۔

آخر میں میں محترم احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سہیل احمد خان، منیر نیازی، صلاح الدین محمود، شہزاد احمد، عطاالحق قاسمی، محسن نقوی، اقبال کوثر، شاہد واسطی، عارف محمود، قائم نقوی، گوہر سلطانہ عظمیٰ، یعقوب پرواز، نصیر کوی، اقبال حیدر بٹ، تنویر ظہور، جہانگیر عمران، منصور آفاق، ازہر منیر، محمد واجد، اختر عثمان، عمران نقوی، اعجاز توکل، عمران حیدر، روبی نزہت، علی اصغر عباس اور مسز اقبال ساجد کا شکر گذار ہوں جنھوں نے کتاب کی تدوین و اشاعت کے مختلف مراحل میں میری معاونت کی۔

جواز جعفری

۲۲ر اگست ۱۹۹۲ء

عہدِ جدید تر کا نمائندہ کون ہے؟

ادیب اسی طرح سوسائٹی کی پیداوار ہوتا ہے، جس طرح اس کا فن زندگی کی طرف اس کے مخصوص ردِ عمل کی پیداوار ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا فنکار بھی شعوری یا لاشعوری طور پر روحِ عصر کی ترجمانی کرتا ہے۔ ٔروحِ عصر کے معنی ہیں کہ کسی ملک کے باشندوں کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، ادبی اور مذہبی افکار و اعمال میں اشتراک۔ یعنی ان کے سوچنے اور عمل کرنے میں ہم آہنگی ہو خواہ یہ حماقت ہی کیوں نہ ہو........ہڈسن کے بقول

"اگرچہ ہر مصنّف کا اپنا اپنا اسلوبِ اظہار ہوتا ہے لیکن زمانے کی غالب روح...... خواہ وہ کچھ بھی ہو...... بالواسطہ یا بلاواسطہ ہر مصنّف کے فن میں منعکس ہوتی ہے۔

کوئی مصنّف روح کے اثرات سے بچ نہیں سکتا، جیسا کہ گوئٹے نے کہا ہے کہ ہر شخص جس طرح اپنے ملک کا باشندہ ہے اسی طرح وہ اپنے زمانے کا بھی باسی ہے۔ رینان کے مطابق ہر شخص کا تعلق اس کی نسل اور زمانے سے ہوتا ہے خواہ وہ اپنے زمانے اور نسل کے خلاف ردِّ عمل کا مظاہرہ ہی کرے۔

اسی طرح ادب جن افکار و جذبات کا اظہار کرتا ہے وہ کسی زمانے کے ساتھ وابستہ اور مشروط ہوتے ہیں۔ زمانہ کسی ادیب و شاعر کے ذہن پر اس لئے اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ اس کا ذہن بہت حسّاس ہوتا ہے۔ اس کے اندر کسی واقعہ کو قبول کرنے یا اس کے خلاف ردِّ عمل کی صلاحیت دیگر تمام افراد سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، للہٰذا ادیب ان چھوٹے بڑے واقعات کو قبول کرنے کے بعد انہیں نہایت لطیف پیرائے میں اپنے فن میں سمو کر پیش کر دیتا ہے۔ شلیگل اور ڈرائیڈن نے بھی ادب اور روح عصر کے باہمی تعلق کی نشاندہی کی تھی، لیکن انہوں نے اس

تعلق پر کسی مستحکم نظریئے کی بنیاد رکھنے کی کوئی مربوط کوشش نہیں کی۔ اس سلسلے میں تین اور سان بو کا طریقِ کار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ تین کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ادب کا مطالعہ سماجی طاقتوں کی پیداوار کے طور پر کیا۔

اس کے نزدیک ادیب اپنے زمانے' معاشرے اور دیگر حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس کے مطابق کسی قوم کی نسلی خصوصیات بھی اس کے ہر عہد کے ادب میں اپنا اظہار کرتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ ادب میں سماجی اور تہذیبی عناصر بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ وہ ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی کو صرف اس کی تخلیقات ہی نہیں بلکہ تاریخ عالم کے دوباب سمجھتا ہے۔ اس کے ہاں ادب کے عمرانی تصور میں سائنس اور منطقی نقطۂ نظر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ادیب کی زندگی کے حالات .... ان کا معاشرت اور روحِ عصر کیساتھ تعلق .... نسل' معاشرہ' ماحول اور اس کے فکری وجذباتی ارتقاء کا کھوج لگاکے اس کے متعلق بہت کچھ جان سکتے ہیں جو اس کے فن وشخصیت کی تفہیم میں معاون ثابت ہو۔ اس طرح تنقیدِ ادب میں نہ صرف شاعر کی سوانح حیات کو مرکزی اہمیت حاصل ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھیں تو ہم ان تمام سماجی تبدیلیوں اور معاشرتی ارتقاء کا جائزہ لیں گے جنہوں نے ادیب کے ذہن اور اس کی سوانح حیات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

مندرجہ بالا طریقِ کار کے مطابق جب ہم اقبال ساجد کے فن کا تجزیہ کریں تو سب سے پہلے اس قسم کے چند سوالات ہمارے سامنے آئیں گے' مثلاً ساجد کے عہد کے سماجی' تہذیبی' سیاسی اور فکری حالات کیا تھے؟ انسانی حقوق اور آزادی کی نوعیت کیا تھی؟ شاعر کا تعلق کس طبقے سے تھا اور اس نے کن طبقوں کو متاثر کیا نیز وہ خود کن طبقوں سے متاثر ہوا؟ اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ اپنے شاعرانہ اور بے بہا تخلیقی جوہر کے باوجود سماجی سطح پر ناکام کیوں رہا؟

آیئے سب سے پہلے ساجد کے عہد اور خاندانی پس منظر کا جائزہ لیتے ہیں۔ اقبال ساجد جب پیدا ہوا تو اس وقت ہندوستانی فضا آزادی کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی۔ ہندوستان پر انگریزی حکمرانی تھی۔ تہذیبی' معاشی اور سماجی سطح پر یہاں کے باشندوں کی زندگی طرح طرح کی مشکلات کا شکار تھی۔ انگریزوں نے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں ایک ایسا جاگیردار طبقہ پیدا کر لیا تھا جو ہر وقت ان کے مفادات کے تحفظ کیلئے کمربستہ رہتا تھا۔ ہندوستان سے باہر بھی دنیا کے اکثر ممالک انگریزی سامراج کے چُنگل میں قید تھے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں سے بیشتر ممالک میں آزادی کی لہریں بھی اٹھ رہی تھیں اور لوگ سیاسی اعتبار سے خاصے بیدار ہو چکے تھے۔ اگر ہم اس عہد کا احاطہ چند لفظوں میں کرنا چاہیں تو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ پورا معاشرہ دو طبقوں میں منقسم تھا' یعنی آقاؤں اور غلاموں میں یا پھر یوں کہیئے کہ ظالموں اور مظلوموں میں۔

انہی حالات میں لندھورا ضلع سہارنپور یوپی...... انڈیا (1939ء) کے ایک پسماندہ گاؤں میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے' والدین جس کا نام اقبال ساجد رکھتے ہیں۔ ساجد کا تعلق شیخ قریشی قبیلے سے تھا اور اس کے والد غلام محمد

فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ساجد کے علاوہ اس کی تین بہنیں تھیں۔ یہ مختصر سا گھرانہ نہایت خوشحالی اور آسودگی کی زندگی بسر کر رہا تھا کہ اچانک غلام محمد ایک فضائی سفر کے دوران حرکتِ قلب بند ہو جانے کے باعث چل بسے۔ نتیجتاً یہ ہنستا بستا گھر طرح طرح کے سماجی معاشرتی اور معاشی مصائب کا شکار ہو گیا۔ ساجد کی بیوہ ماں اس جذباتی و معاشی دھچکے کی تاب نہ لاتے ہوئے ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ یہیں سے اقبال ساجد کے المیئے کی ابتداء ہوتی ہے۔

غلام محمد کی وفات کے بعد ان کے بچوں کی ذمہ داری ان کی بہن اور بہنوئی نے قبول کی۔ اگرچہ ساجد کے پھوپھا اور پھوپھی پر بیک وقت دو خاندانوں کا بوجھ آن پڑا تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اقبال ساجد کو قصبہ شیر کوٹ ضلع بجنور یو۔ پی کے اسکول میں داخل کروایا لیکن یہاں ابھی اس نے ابتدائی چند جماعتیں پاس کی تھیں کہ اچانک ہندوستانی زندگی سماجی سیاسی اور تہذیبی سطح پر ایک ایسی بڑی تبدیلی...... قیامِ پاکستان...... سے دوچار ہوئی کہ نتیجتاً انسانی رشتوں اور تعلقات کی نوعیت ہی بدل گئی۔ آزادی کے نام پر دونوں جانب اتنا خون بہا کہ پنجاب کے پانچوں دریاؤں کا پانی سرخ ہو گیا اور پھر ہجرت کے اسی مجموعی ریلے میں اقبال ساجد بھی اپنی ماں کی انگلی تھامے پاکستان چلا آیا۔

لاہور میں یہ لُٹا پُٹا مختصر سا خاندان احاطہ دوتوشاہ...... موجودہ آسٹریلیا چوک...... میں ایک نہایت تنگ و تاریک مکان میں رہنے لگا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کی زندگی اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود قدرے مربوط اور متحد زندگی تھی، لیکن تقسیم کے بعد جو معاشرہ تشکیل پایا یہ آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے باوجود ہر سطح پر انتشار کا شکار تھا۔ اوپر سے اس نئی مملکت کے باشندوں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ بانیٔ پاکستان ابھی اس نوزائیدہ مملکت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان کا سفرِ حیات ختم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی وطنِ عزیز میں قیادت کا ایسا بحران پیدا ہو کہ آج تک اس پر قابو نہیں پایا جا سکا۔ قائد کے بعد لیاقت علی بھی جلد ہی شہید کر دیئے گئے اور پھر ہر شخص راتوں رات پورے ملک کی قیادت سنبھالنے کے لئے ہر طرح کے ذاتی، قومی اور ملکی مفادات کو داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ پوری زندگی ایڈہاک ازم کے سہارے چل رہی تھی لیکن اس دیس کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ ملک ایک دو ماہ نہیں بلکہ پورے 9 سال تک بغیر آئین کے چلتا رہا اور 23 مارچ 1956ء میں کہیں جا کر...... وزیراعظم چودھری محمد علی کے عہد میں...... پاکستان کا پہلا آئین وجود میں آیا۔ لیکن یہ آئین ابھی دو اڑھائی سال بھی نہیں چل پایا تھا کہ 26 اکتوبر 1958ء کے ایوبی مارشل لاء نے اس آئین کے تقدّس کو تاراج کر دیا اور وطنِ عزیز آمریت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی اور انسانی حقوق اور آزادیاں سلب کر لی گئیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اقبال ساجد شعور اور جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے۔ 1958ء میں وہ 19 برس کا ہو چکا تھا۔ اس کے ارد گرد جو کچھ ہو رہا تھا ان حالات سے وہ نہ صرف باخبر تھا بلکہ ان سے متاثر بھی ہو رہا تھا۔ اس وقت انسان دن بدن سماجی سطح پر اپنی شناخت

کھو رہا تھااور معاشی اور ذہنی طور پر وہ عدم استحکام کا شکار ہو چلا تھا۔ اس سماجی و سیاسی منظرنامے کو ساجد ایک بالغ نظر شاعر کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا وہ اپنے علاوہ ان تمام طبقوں کا نمائندہ تھا جنہوں نے اچھے دنوں کے انتظار میں پاکستان کی طرف ہجرت کی تھی لیکن جب لوٹ کھسوٹ کے اس معاشرے میں ان کے عزائم اور سہانے خواب استحصال اور خود غرضی کی چٹانوں سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہوئے تو ساجد ان تمام لوگوں کی زبان بن گیا۔

رُخِ روشن کا روشن ایک پہلو بھی نہیں نکلا
جسے میں چاند سمجھا تھا وہ جگنو بھی نہیں نکلا

لاہور آنے کے بعد ساجد کا خاندان شدید قسم کی مالی مشکلات کا شکار تھا' چنانچہ وہ قسمت آزمائی کے لئے کچھ دیر کراچی چلا گیا۔ وہاں وہ محنت مزدوری کرتا رہا اور بیگم ساجد کے مطابق وہاں اس نے میٹرک کا امتحان بھی پاس کیا۔ کراچی سے واپسی پر اس کی شادی ہوگئی اور اس کے بعد وہ ہمیشہ لاہور ہی میں رہا۔ 1979ء میں وہ اپنی فیملی سمیت ہندوستان بھی گیا۔ وہاں اس کی بڑی قدر ہوئی اور اس نے انبالے 'لال قلعے' دہلی اور دیگر شہروں میں کامیاب مشاعرے پڑھے اور وہ پانچ ماہ تک انڈیا میں قیام پذیر رہا۔

شادی کے وقت ساجد شعر کہنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتا تھا' اس کی بوڑھی ماں اور خاندان کے دیگر لوگوں کا خیال تھا کہ شادی کے بعد گھریلو ذمہ داریوں کے پیش نظر شاید کوئی کام کرنے لگے' لیکن اس نے سماجی' معاشی اور معاشرتی ذمہ داریوں کو کبھی بھی پوری طرح قبول نہیں کیا اور گھر کی مالی حالت جو پہلے ہی بہت کمزور تھی روز بروز خراب سے خراب تر ہونے لگی۔ بیگم ساجد کے بقول

"شادی کے وقت وہ صرف شعر کہا کرتے تھے' یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ اس کے علاوہ میں نے اپنی زندگی میں انہیں کوئی اور کام کرتے نہیں دیکھا۔ شادی کے بعد میں انہیں اکثر کہتی کہ آپ کوئی کام کیا کریں' تو جواباً وہ ایک ہی بات کہتے دیکھنا میں شاعری کے ذریعے ایک دن اتنا امیر ہو جاؤں گا کہ تم سب کچھ بھول جاؤگی' تم دیکھنا میری کتابیں لاکھوں میں فروخت ہوں گی۔"

ساجد کے خاندان کے لوگ سنگ تراشی کے پیشے سے وابستہ تھے۔ ساجد نے بھی کچھ دنوں ایک عزیز کے ہاں ملازمت کی لیکن اپنی لا اُبالی طبیعت کے ہاتھوں اسے جاری نہ رکھ سکا۔ اس نے اگرچہ زندگی کا ساتھ دینے کی تھوڑی بہت کوشش کی مگر در حقیقت وہ صرف ایک شاعر تھا' ایک ایسا شاعر جو شعر کہنے کے علاوہ ہر طرح کی سماجی و معاشرتی ذمہ داری پوری کرنے سے قاصر تھا' وہ خود کہتا ہے۔

لوگوں نے زر کے واسطے کیا کچھ نہیں کیا؟
اور ہم نے شاعری کے سوا کچھ نہیں کیا

بات صرف یہیں تک رہتی تو شاید زیادہ خطرناک نہیں تھی' لیکن ساجد کے المیاتی افسانے میں کلائمکس اس وقت آیا جب اس نے ایک دن چپکے سے شراب نوشی شروع کر دی' غالباً 1975ء کے قریب اس کی مے نوشی کا آغاز ہوا۔ بیگم ساجد کے بقول ایک رات جب وہ گھر لوٹا تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے

تھے۔ اس پر گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد شدید احتجاج ہوا۔ جھگڑے ہوئے، لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ بلکہ دن بدن اس کی مے نوشی میں شدت آنے لگی اور آخر تنگ آکر اہلِ خانہ نے اس موضوع پر بات کرنا ہی چھوڑ دی۔ جب ہر طرف سے احتجاج اور ملامت و مذمت ختم ہو گئی تو ساجد بڑی آزادی کے ساتھ شراب پینے لگا۔ اب تو وہ بلا روک ٹوک شراب کی بوتل گھر بھی لے آتا تھا اور بچوں کے درمیان بیٹھ کر پیتا، بچے اگر منع کرتے تو کہتا "شراب پینا تو غالبؔ کا شیوہ ہے" بچے ہنستے اور کہتے "ابو آپ تو واقعی غالبؔ بنتے جا رہے ہیں"

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ شروع شروع میں ساجد شراب سے سخت نفرت کرتا تھا، اس سلسلے میں بیگم ساجد نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ ساجد کی والدہ ہمسائے کے گھر سے پان لے آئی۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ شراب نوشی کرتا ہے، ساجد کو پتہ چلا تو ماں کے ہاتھ سے پان چھین کر دُور پھینکتے ہوئے بولا "شرابی کے گھر کا پان کھاؤ گی؟" اسی طرح پاک ٹی ہاؤس کے منیجر زاہد سراج کا کہنا ہے کہ 1968ء کے قریب ساجد دوسروں کو شراب نوشی سے منع کیا کرتا تھا۔ جہاں تک ساجد کی مے نوشی کے محرّکات تلاش کرنے کی بات ہے تو اس سلسلے میں بے شمار افسانے مشہور ہیں، عباس تابش کے بقول

"اقبال ساجد کو شراب نوشی کی ذِلّتوں میں گرانے والا شخص خود بھی ایک معروف شاعر ہے اور لاہور ہی میں مقیم ہے۔ وہ ساجد کی غزل کی لے سے ابتدا ہی میں خوفزدہ ہو گیا تھا، چنانچہ اس نے ساجد کو شراب نوشی کی عادت ڈال دی اور کہا کہ "تم جتنی زیادہ شراب پیو گے، اتنے ہی بڑے شاعر بنو گے" وہ شاعر جانتا تھا کہ ساجد غریب آدمی ہے کب تک شراب خرید کر پی سکے گا، آخر اپنی ہی آگ میں جل جل کر مر جائے گا۔

اقبال ساجد کی بیگم نے بڑے یقین سے کہا کہ

"مجھے یقین ہے کہ ساجد کو شراب ان شاعروں نے لگائی جو انہیں اپنا حریف سمجھتے تھے۔

یہ تو چند نام ہیں اگر غور کیا جائے تو ہر وہ شخص ساجد کے بچوں کا مجرم ہے جس نے ایک روپیہ بھی اسے شراب کے لئے فراہم کیا۔ اس جرم میں وہ استحصالی شاعر بھی شامل ہیں جو چند روپوں یا ایک "کپّی" کے عوض اس کی غزلوں کی نیلامی کرتے تھے۔ انہی کرم فرماؤں کے غیر ادبی ہتھکنڈوں اور سماجی زندگی کے سنگین حقائق سے فرار کے باعث ساجد دن بدن شراب کی دلدل میں اُترتا چلا گیا۔

وہ لوگ جنہوں نے اسے شراب کی علّت میں مبتلا کیا تھا آخر کب تک اس کا ساتھ دیتے؟ آخر سب ہوا ہو گئے۔ اب ساجد کے لئے شغلِ مئے نوشی کو جاری رکھنا مسئلہ بن گیا، چنانچہ اس نے مزید تیزی کے ساتھ اپنی غزلیں اونے پونے بیچنی شروع کیں۔ خریدنے والوں میں صرف کالجز کے لڑکے اور لڑکیاں ہی شامل نہیں بلکہ سچ پوچھئے تو ان میں موجودہ عہد کے بعض ایسے شاعر اور شاعرات کے نام بھی آتے ہیں جو سماجی اعتبار سے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔

کسی دانشور نے کہا ہے کہ بعض

اوقات کسی گمنام ادیب کے مرنے سے بڑے بڑے نامور ادیب مرجاتے ہیں۔ دراصل ان لوگوں کو اقبال ساجد کی موت کی صورت میں اپنی موت نظر آرہی ہے۔ وہ اپنی شہرت کی کاغذی کشتی کو وقت کے طوفان سے بچانے کے لئے تگ ودو میں مصروف ہیں اور ڈر تو اس بات کا ہے کہ کہیں یہ شاعر اپنی مصنوعی شہرت کو برقرار رکھنے کے لئے کسی اور شاعر کو اقبال ساجد نہ بنا ڈالیں آخر ان متمول شعراء کے لئے یہ بات کونسی مشکل ہے؟

ساجد اپنی محرومیوں کے باعث اپنی غزلیں سستے داموں ضرور بیچ دیتا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو ملامت بھی کرتا ہے۔

یہ تیرے اشعار تیری معنوی اولاد ہیں
اپنے بچے بیچنا اقبال ساجد چھوڑ دے

ساجد کا المیہ یہ تھا کہ سماجی سطح پر وہ بالکل ایک ناکام انسان تھا۔ اس کے ناتواں کاندھوں پر ایک بیوی اور آٹھ عدد بچوں کا بوجھ تھا' جبکہ اس کا ذریعۂ معاش نہ ہونے کے برابر تھا اور اوپر سے اسے شراب نوشی کی عادت تھی۔ چنانچہ یہیں سے ایک اور المیئے نے جنم لیا اور ساجد نے شراب کی خاطر اپنے اندر کے انسان کا گلا گھونٹ کر لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانا شروع کر دیئے۔ اس کے مانگنے کے طریقے بڑے عجیب وغریب ہوتے تھے' مثلاً میرے دانت میں درد ہے' میرا بچہ بیمار ہے' کئی روز سے کھانا نہیں کھایا' میری بیوی ہسپتال میں داخل ہے وغیرہ وغیرہ

دوستوں کے گھروں سے کتابیں پڑھنے کی غرض سے لے آتا اور بیچ کر شراب پی لیتا۔ شروع شروع میں دوست احباب اس کی مدد کرتے تھے' آخر کب تک؟ جُونہی وہ پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہوتا' اکثر پیشانیاں شکن آلود ہو جاتیں' وہ جس ٹیبل پر بیٹھتا شاعر ادیب کھسکنے لگتے اور وہ یاروں کی محفل میں تنہا رہ جاتا۔

آخری عمر میں تو اس کی ساری ضروریاتِ زندگی کا دارومدار مانگنے پر تھا۔ بیگم ساجد کے بقول "ان کے مانگنے کی خبر میرے لئے شراب نوشی سے بھی زیادہ صدمے کا باعث بنی" ہم نے سمجھایا' سختی کی' نتیجتاً انہوں نے راتوں کو گھر آنا ہی چھوڑ دیا' پتہ نہیں کہاں رہتے تھے۔ بیٹی کی شادی کے بعد تو بالکل مسافروں کی طرح گھر میں آتے تھے"

گھٹیا قسم کی شراب پی پی کر ساجد صحت سے ہاتھ دھو بیٹھا اور دمہ' ٹی بی' ضعفِ جگر' کالی کھانسی اور تپ دق جیسی مُوذی بیماریاں بیک وقت اسے لاحق تھیں۔ ان خطرناک بیماریوں سے وہ ایک عمر تک جنگ کرتا رہا' بالآخر ہار گیا۔

ایسا نہیں کہ اس کا علاج بالکل ہی نہیں کرایا گیا' کتنی ہی مرتبہ اس کے مہربان دوستوں تنصیر الحسنین' شریف جنجوعہ' شاہد واسطی' احمد ندیم قاسمی' کشور ناہید اور دیگر احباب نے اسے ہسپتال میں داخل کرایا' مگر وہ

ہسپتال کے بستر سے اٹھ کر شہر میں منعقد ہونے والے کسی ایسے مشاعرے میں جا پہنچتا جہاں سے اسے معاوضہ ملنے کی توقع ہوتی۔ علاوہ ازیں اکادمی ادبیاتِ پاکستان نے کئی مرتبہ سرکاری سطح پر مرحوم کا علاج کرایا۔

گھٹیا اور مُضرِ صحت اشیاء کے مسلسل استعمال اور کثرتِ مے نوشی کے باعث وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔ اب وہ اس اسٹیج پر پہنچ چکا تھا جہاں اس کی زندگی اور موت دونوں شراب کے حوالے سے تھیں۔ لوگ اسے دیکھ کر مختلف طریقوں سے اپنے ردِّ عمل کا اظہار کرتے۔

یہ سچ ہے کہ اس کی موجودگی اکثر لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث بنتی تھی مگر ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اس کی ظاہری کمزوریوں کے بجائے............ اور پھر کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں؟............ اس کے اندر چھپے ہوئے خوبصورت شاعر سے پیار کرتے تھے۔ لاہور میں رہائش پذیر ان شاعروں' ادیبوں اور زندگی کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات کی فہرست ہزاروں پر مشتمل ہے جو ہر ماہ ساجد کو ایک مخصوص رقم بڑی باقاعدگی کے ساتھ دیا کرتے تھے۔ ادیب برادری میں ایسے لوگوں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد موجود ہے جنہوں نے بے شمار مواقع پر ساجد کی مالی معاونت کی۔

مثال کے طور پر کشور ناہید اور دیگر دوستوں کے تعاون سے ایک بھرپور مہم چلائی گئی جسکے نتیجے میں جمع ہونے والے روپوں سے ساجد کے بچوں کو ایک چھت فراہم کی گئی۔ اب یہ فلیٹ مرحوم کی بیوہ کے نام منتقل ہو چکا ہے۔

علاوہ ازیں شاہد واسطی اور دیگر دوستوں کی کوششوں سے اکادمی ادبیاتِ پاکستان نے مرحوم کی زندگی ہی میں اس کے بچوں کو 750 روپے بطور وظیفہ دینا شروع کئے۔ یہ الگ سوال ہے کہ اتنے روپے میں آج کے مہنگے دور میں آٹھ افراد پر مشتمل ایک خاندان زندہ رہ سکتا ہے؟ جو تا حال مل رہے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے اکثر و بیشتر مرحوم کی مدد کی۔ انہوں نے عطاء الحق قاسمی کے تعاون سے دو مرتبہ اکادمی ادبیات سے پچیّس پچیّس سو روپے دلوائے۔ اسی طرح مرحوم کی بیٹی کی شادی کے موقع پر ماہنامہ "نقوش" کے مدیر جاوید طفیل نے بارات کے کھانے کا آدھا خرچہ ادا کیا۔

مالی معاونت کے علاوہ بعض ادیب دوستوں نے مرحوم کو ملازمت دلوانے میں مدد کی۔ لیکن بقول زاہد سراج وہ ہر مرتبہ نہ صرف سروس چھوڑ کر آجاتا بلکہ اپنے انہی محسنوں کے خلاف بیان بازی بھی کرتا۔

دراصل مرحوم ایک کم تعلیم یافتہ انسان تھا' اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنے بہترین شاعر ہونے کا بھی شدید ترین احساس تھا' لہٰذا اس کی خواہش تھی کہ سروس اس کے شعری مرتبے کے شایانِ شان ہو۔ 81-1980ء میں ریڈیو پاکستان لاہور میں اسے کاپی رائٹر کی ملازمت دلوائی گئی مگر مذکورہ بالا وجوہ کے باعث وہ وہاں زیادہ دن تک کام نہیں کر سکا۔ دراصل وہ ایک نفسیاتی مریض بن چکا تھا۔ ایک طرف اس کی شاعرانہ اَنا تھی اور دوسری طرف زندگی کے سنگلاخ حقائق ، جن کے سامنے وہ اتنا بے بس تھا کہ خور د و نوش کی معمولی چیزوں کے لئے اسے دن میں کتنی ہی چوکھٹوں پر جھکنا پڑتا تھا۔ بس ایک مقام تھا جہاں وہ گردن جھکانے کے بجائے گردن

تان کر کھڑا ہو جاتا اور کسی بھی قیمت پر مفاہمت نہ کرتا تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں اسے قائل کرنے کی کوشش کی جاتی کہ "فلاں شاعر تم سے بہتر ہے" باقی شاعروں کو تو چھوڑیں وہ تو یہاں تک کہتا تھا.........

فراقؔ و فیضؔ و ندیمؔ و فرازؔ کچھ بھی نہیں

نئے زمانے میں ان کا جواز کچھ بھی نہیں

بلکہ اس سلسلے میں اس کی خودسری کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ مذکورہ شعر پڑھنے کے بعد احمد فراز نے اس سے گلہ کیا کہ "میں تو جدید زمانے کا شاعر ہوں مگر تم نے میرا جواز تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے" تب ساجد نے بڑی بے نیازی سے کہا کہ "فیض اور ندیم تو بہرحال ایسے شاعر ہیں جنہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن تم تو اس صف میں ہی نہیں آتے' بلکہ تمہارا نام تو شعر میں قافیئے کی مجبوری کے باعث آگیا ہے"

ساجد کے پاس اس شعری انا کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ دراصل وہ معاشرے کا ٹھکرایا ہوا ایک ایسا فرد تھا جسے ذہنی اور مالی استحکام میسّر نہیں تھا لہٰذا اسے شراب نوشی کو جاری رکھنے کے لئے بڑے بڑے ناپسندیدہ کام کرنے پڑے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ شراب کے لئے خون تک فروخت کرنے لگا تھا اور کئی ایک لوگوں سے یہ بھی سنا کہ وہ شراب کے لئے چھوٹی موٹی چوریوں سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ مرحوم کے ہمسائے میں بسنے والے ایک معروف شاعر نے ایک ملاقات میں ساجد پر متعدد اشیاء کی چوری کے الزامات عائد کئے لیکن شاہد واسطی نے ایسی باتوں کی تردید کی ہے۔

یہ درست ہے کہ مرحوم کی بعض عادات کے باعث اسے بعض لوگ ناپسند کرتے تھے' لیکن اس کے باوجود اس کے اندر دوسروں سے محبت کرنے والا انسان موجود تھا۔ وہ دوستوں سے مانگتا ہی نہیں' بلکہ کبھی کبھار ان پہ خرچ بھی کرنا چاہتا تھا۔ ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں جب وہ دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر انہیں چائے پلانا یا کھانا کھلانا چاہتا تھا' لیکن اگر کوئی دوست اس کی پیشکش قبول نہ کرتا تو وہ مارنے مرنے پر تیار ہو جاتا۔

ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر برا انسان نہیں تھا بلکہ حالات اور ضروریات نے اسے بہت سے غلط کاموں پر مجبور کیا۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جسے مالی اور ذہنی استحکام میسر نہیں تھا۔ ہمارے ہاں بے شمار لوگ ایسے ہیں جن کی آمدنی ایک ہزار روپے ماہوار تک ہے' لیکن پھر بھی وہ قدرے مطمئن ہیں کیونکہ انہیں اس بات کا پورا یقین ہوتا ہے کہ مہینے کے آخر میں انہیں ایک ہزار روپے ضرور ملیں گے۔ لیکن جس شخص کی آمدنی ایک پائی بھی نہ ہو اسے سکون کہاں سے ملے گا؟ وہ کسی اخلاق اور معاشرتی ضابطے کا خیال کیونکر رکھے گا؟

ساجد کا المیہ یہ ہے کہ وہ جدید عہد کے بے مہر صنعتی اور غیر تخلیقی معاشرے کا ساتھ نہ دے سکا۔ ایک ایسا معاشرہ جو اپنے سارے گناہوں کا بوجھ اپنے ضعیف ترین عضو پر ڈال دیتا ہے اور بھلا شاعر سے زیادہ کمزور عضو اور کون ہو سکتا ہے۔ ؟لہٰذا مشینی عہد نے ساجد کو برباد کر دیا جو معاشرہ اپنی بات سننے کے لئے تیار نہیں وہ ساجد کی بات پر کیسے کان دھرتا؟

یہ درست ہے کہ ڈاکٹر طارق عزیز جیسا معذور تخلیق کار معاشرے پر بوجھ بننے کے بجائے معاشرے کے ایک معزز فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا ہے لیکن ایسی مثالیں بہت ہی کم ہیں۔ صنعتی اور غیر تخلیقی معاشرہ اکثر و بیشتر جینیئس لوگوں کو ضائع کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوسائٹی کے دیگر افراد صرف ایک سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں جبکہ فنکار کو بیک وقت دو سطحوں پر زندہ رہنا پڑتا ہے۔ وہ معاشرے کا ایک رکن بھی ہوتا ہے جس پر چند سماجی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جبکہ دوسری طرف وہ ایک فنکار بھی ہوتا ہے جس کی حسّاس طبیعت میں ایک فطری آزادگی ہوتی ہے جو فضول قسم کی جاوبیجا پابندیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ نتیجتاً فنکار اپنی زندگی کے ان دو رخوں کے درمیان وحدت قائم رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ جب فنکار معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو پاتا تو معاشرہ اسے ایک ناکام سماجی انسان قرار دے کر اس سے اپنی سماجی سہولیات واپس لے لیتا ہے۔ لیکن فنکار کے لئے اس کی سماجی حیثیت اتنی اہمیت نہیں رکھتی، جتنی کہ اس کی فنّی اور تخلیقی حیثیت۔ لہٰذا فنکار اپنی ذات کے ہر پہلو اور خواہش سے دستبردار ہو سکتا ہے لیکن وہ تخلیقی زندگی سے ہاتھ نہیں کھینچ سکتا۔ جب فنکار کی سماجی اور تخلیقی زندگی کی وحدت پارہ پارہ ہوتی ہے تو یہیں پہ اس کا المیہ جنم لیتا ہے۔

اقبال ساجد ایک غریب آدمی تھا اس کے پاس کوئی بڑا عہدہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ حلقہ ستائش باہمی کا رکن تھا جبکہ ہمارے ہاں صرف اسی شاعر کو بڑا سمجھا جاتا ہے، رسائل و جرائد صرف اسی کے فن و شخصیت کے نمبر نکالتے ہیں جو سماجی اعتبار سے کسی بڑے عہدے پر فائز ہو۔ ساجد کے پاس یہ چیزیں نہیں تھیں، لہٰذا ہمارے معاشرے نے ساجد کو بطور شاعر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ساغر صدیقی، استاد دامن اور اقبال ساجد کا تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں فاقہ مستی کی حالت میں جان دے دینا، ہمارے ہاں فنکار کی ناقدری اور صنعتی معاشرے کی بے رحمی اور بے حسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جدید عہد "مقابلے" کا عہد ہے۔ یہ عہد فن اور فنکار کے لئے سازگار نہیں۔ یہ عہد اقدار کے بجائے مقدار پر یقین رکھتا ہے اور فنکار تو نہ صرف زندگی کی اعلیٰ قدروں کی ترویج کرتا ہے بلکہ وہ اقدار سازی بھی کرتا ہے۔

ایسا معاشرہ جو اپنے گھروں کو بھرنے میں مصروف ہو وہ ذات کے اندر کو بھرنے والی قدروں پر کیسے یقین کرے گا؟ یہی اقبال ساجد کا المیہ ہے۔ ساجد جدید معاشرے کے قیامت خیز کمپٹیشن کی نذر ہو گیا۔

یہ درست ہے کہ ساجد نے اپنے آپ کو خود تباہ کیا، اپنی جان کو بڑی تیزی کے ساتھ خرچ کیا، بلکہ وہ تو ایک ایسا سگریٹ تھا جو بیک وقت دونوں اطراف سے جل رہا ہو........ لیکن اس تباہی میں ہمارا بھی ہاتھ ہے۔ افسوس تو یہی ہے کہ ہمارے ادیبوں کے پاس باہمی معاونت کے لئے کوئی وقت نہیں بلکہ وقت کے سمندر میں ہماری حیثیت ان جزیروں کی سی ہے جو ایک ہی سمندر میں واقع ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔

ساجد کی موت پر ادیب برادری نے جس بے حسی کا ثبوت دیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس کی موت پر

کوئی قرار دادِ تعزیت پیش نہیں ہوئی۔ زاہد سراج کے بقول ٹی ہاؤس میں ادیب شاعر معمول کے مطابق قہقہے لگا رہے تھے بلکہ اس کی موت پر بعض حلقوں نے یوں محسوس کیا جیسے ان کے سروں سے بہت بڑا خطرہ ٹل گیا ہو۔

یہ ردِ عمل کسی حد تک درست ہے بلکہ اس پر حیران ہونا ہی نہیں چاہئے جس سوسائٹی کے پاس اپنے بارے میں سوچنے کے لئے وقت نہیں وہ اقبال ساجد سے متعلق کیا سوچے گی؟ یہ قصور کسی فردِ واحد کا نہیں بلکہ یہ تو اجتماعی ذہن کا ردِ عمل ہے۔ ساجد ایک ایسا مظلوم انسان تھا' جسے لوگوں نے ہر طرح کے ناپسندیدہ کام کرنے پر پہلے تو مجبور کیا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اپنے بھی تمام تر گناہوں کا بوجھ اس کے کندھوں پر ڈال کر اسے تمام تر ہمدردیوں سے محروم کر دیا۔ لوگ تو ادیب کو ترغیبِ گناہ بھی خود ہی دیتے ہیں اور پھر خود ہی دار پر بھی کھینچ دیتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی نے لکھا ہے۔

"اقبال ساجد بہت عجیب شخص تھا' مہمل باتیں کرتا تھا' وہ انا کا پہاڑ تھا مگر ہر روز ریزہ ریزہ ہوتا تھا۔ وہ غریب بہت تھا مگر اپنی غزلوں کی دولت بانٹتا پھرتا تھا۔ سہانے خواب دیکھتا تھا مگر ڈراؤنی تعبیروں کا سامنا کرتا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کی تواضع کرنی چاہتا تھا' مگر اسے خالی جیب کی ندامت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ اپنے بچوں سے بے حد محبت کرتا تھا مگر ان کے آنسو بھی نہیں پونچھ سکتا تھا' اسے اپنے گھر سے محبت تھی مگر اس سے محبت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے تھے"

یہی عجیب و غریب شخص انیس مئی انیس صد اٹھاسی (19-5-88) کو جبکہ اس کے بیوی اور بچے کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے' اپنے گھر داخل ہونے لگا تو اس کی دہلیز پر ہی گر گیا اور جب ہمسائے اسے اٹھانے کے لئے آگے بڑھے تو پتہ چلا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کا آدھا جسم دہلیز کے باہر اور آدھا دہلیز کے اندر مردہ پڑا تھا۔

آج سے بہت پہلے میتھیو آرنلڈ نے ادب کو تنقیدِ حیات کا نام دے کر ادب اور زندگی کے درمیان ایک نہایت مضبوط رشتے کی نشاندہی کی تھی بالکل اسی طرح اقبال ساجد کا نظریہ فن بھی تنقیدِ حیات ہی ہے۔ وہ شعر کو صرف جمالیاتی تسکین کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے اسے تنقیدِ حیات سمجھتا ہے اور شعر سے اصلاحِ معاشرہ کا کام لینا چاہتا ہے۔ وہ ایک نقّاد کی طرح معاشرتی کمزوریوں' ناہمواریوں اور خامیوں پر سے پردہ اٹھاتا ہے اور ایک مُصلح کی طرح سماجی اصلاح کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ ہمارے عہد کی وہ تمام چھوٹی بڑی برائیاں جو معاشرے کے جسد کو دیمک کی طرح کھا رہی ہیں' ساجد نے ان سب کی بڑی ہوشمندی کے ساتھ نشاندہی کی ہے۔ ایسی ایسی سماجی ناہمواریاں جن کی طرف عام انسان یا شاعر کی نظر تک نہیں جاتی ساجد انہیں بھی اپنے شعری تجربے کا حصہ بناتا ہے۔ اس کے موضوعات کا ہماری روزمرہ زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس نے اپنی شاعری میں جن مسائل کو موضوع بنایا ہے وہ اس عہد کے ہر دوسرے انسان کے مسائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ساجد کی شاعری ہمیں بالکل اجنبی نہیں لگتی۔ ساجد کی غزلوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف خود ایک عام انسان ہے بلکہ وہ عام انسانوں کا شاعر بھی ہے۔

ہمارے ہاں ایسے شاعروں کی کمی نہیں جو گرم سُوٹ پہن کر' فائیو سٹار ہوٹل میں بیٹھ کر ایک ہزار روپے کا کھانا کھانے کے بعد فٹ پاتھ پر سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بھُوکے پیاسے اور بے لباس انسان پر نظم لکھتے ہیں لیکن ان کی نظمیں پڑھنے کے بعد یوں لگتا ہے جیسے وہ نظم کے پیرائے میں دنیا کا سب سے بڑا جھُوٹ بول رہے ہوں۔ لیکن جب ساجد جیسا شاعر دسمبر کی ٹھٹھرتی ہوئی راتوں میں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اپنی بات کرتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی نہیں بلکہ ہم سب کی کہانی کہہ رہا ہے۔ اس اپنائیت کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق اپنے ہی جیسے غریب آدمی سے ہے اور غربت دوسرے شاعروں کا شاید مشاہدہ ہو لیکن ساجد کا تجربہ ہے۔

جہاں تک اس کے موضوعات کا تعلق ہے اس کے موضوعات چھوٹے چھوٹے واقعات سے لے کر بڑے بڑے حادثات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے عدالتی اور انتظامی اُمور میں عدمِ انصاف اب کسی سے ڈھکی چھُپی بات نہیں' دیکھئے ساجد نے ان نظاموں پر کتنی گہری طنز کی ہے۔

تفتیش اپنے ہاتھ میں لے اپنے قتل کی
خود ہی تلاش شہر میں جائے وقوع کر
ظالم معاشرے کی صفائی میں کچھ نہ کہہ
قاتل کے حق میں دے نہ شہادت کرائے پر

آبادی میں دن بدن بے پناہ اضافے اور رہائشی سہولتوں کے فقُدان کے گمبھیر مسئلے کو ساجد ایک بالغ نظر شاعر کی حیثیت سے بڑی تشویش کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور آنے والے دنوں میں رہائشی مسئلے کے مزید پیچیدہ ہو جانے کے بارے میں بڑی فکر انگیز پیش گوئی کرتا ہے۔

بھر جائے گی زمین کی صورت فضا بھی کل
اُٹھ جائے گی خلاء کی بھی وسعت کرائے پر

گزشتہ چند سالوں سے ہماری قومی اور سماجی زندگی جس ڈگر پر چل نکلی ہے۔ اس کی عکاسی ساجد نے بڑی اُستادانہ مہارت کے ساتھ کی ہے

جیسے ہر چہرے کی آنکھیں سر کے پیچھے آ لگیں
سب کے سب اُلٹے ہی قدموں سے سفر کرنے لگے

آباد ہوئے جب سے یہاں تنگ نظر لوگ
اس شہر نے ماحول کشادہ نہیں پہنا

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

ساجد کا زمانہ معاشرتی، تہذیبی، سیاسی اور فکری اعتبار سے بڑا پُر آشوب تھا۔ اس عصری انتشار کو واضح کرنے کے لئے ساجد نے جو تصویریں پیش کی ہیں وہ اتنی متحرک اور مکمل ہیں کہ ان کے ذریعے ساجد کے عہد کے انتشار کی ایک ہمہ گیر تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس نے یہ تصویریں اتنی مہارت اور خوبصورتی کے ساتھ بنائی ہیں کہ اس کی غزل میں ”شہر آشوب“ کے اثرات جا بجا نظر آتے ہیں۔

باندھ دے شاخوں سے تو مٹی کے پھل کاغذ کے پھول
یہ تقاضا راہ ہیں اُجڑے شجر کرنے لگے
اب پڑھے لکھے بھی ساجد آ کے بیکاری سے تنگ
شب کو دیواروں پہ چسپاں پوسٹر کرنے لگے
اُگا نہ سبزہ تو اس نے اداس گھر کی منڈیر
پلاسٹک کی ہری بیل سے سجائی دیکھ

ساجد کے ہاں فطرت سے محبت کا بڑا گہرا احساس ملتا ہے۔ اگرچہ اس کی غزل کی لفظیات ہمارے عہد کی غزل سے قدرے مختلف ہے لیکن اس کے ہاں فطری عناصر کے اظہار کے لئے بعض مخصوص الفاظ ملتے ہیں۔ فطرت سے اس کی دلچسپی کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس کے اندر اس قسم کی شاعری کرنے کے لئے کتنا جوہر موجود تھا۔ ساجد بظاہر زندگی میں بہت کُھردرا نظر آتا تھا جیسے لطیف اور نازک اشیاء سے اس کا دُور کا تعلق بھی نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ باہر کی فطرت سے جب اس کا تعلق ٹوٹا تو اس نے یہ سارے پھل، پھول، سبزہ، درخت اور بیلیں اپنے اندر اُگا لئے تھے۔ وہ فطرت کے خوبصورت مظاہر کو دیکھ کر دوسروں کو بھی انہیں دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے اپنے ہاں بصارت اور مشاہدے کا عمل تو تیز اور گہرا ہے ہی لیکن وہ اپنے ارد گرد کے تمام لوگوں کو بھی فطری اشیاء کے مشاہدے پر اُبھارتا ہے۔

سحر شعاعوں میں شبنم پرو کے لائی دیکھ
اُٹھ آنکھ کھول کے منظر کی خوشنمائی دیکھ
اُلٹ دی شام کو سورج نے روشنی کی دوات
فضا میں پھیل گئی سرخ روشنائی دیکھ

اپنی تمام تر معاشرتی اُکتاہٹ اور بیزاری کے باوجود ساجد کا لہجہ کہیں کہیں بڑا اخلاقی اور حکیمانہ ہو جاتا ہے وہ زندگی میں ایک خاص قسم کی خوش سلیقگی اور مہذب پن کی بات کرتا ہے۔

پھینک یوں پتھر کہ سطحِ آب بھی بوجھل نہ ہو
نقش بھی بن جائے اور دریا میں بھی ہلچل نہ ہو
سائے کی طرح بڑھ نہ کبھی قد سے زیادہ
تھک جائے گا بھاگے گا اگر حد سے زیادہ

جدید اردو شاعری میں تمثال کاری کا رجحان بہت نمایاں ہے۔ نئے شعراء نے اپنے عہد کے تہذیبی، سماجی اور فکری آشوب کو نمایاں کرنے کے لئے شعری تمثالوں سے خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ بیسویں صدی کے انگریزی ادب میں ایذرا پاؤنڈ نے اس رجحان سے خصوصی شغف کا اظہار کیا ہے۔ ایذرا پاؤنڈ اور اس کے ساتھیوں نے تمثال کاری کو ایک عالمی ادبی تحریک بنا دیا، جس سے دنیا بھر کی شاعری متاثر ہوئی۔ جدید اردو شعراء نے بھی تمثال کاری سے بڑی رغبت ظاہر کی ہے۔ اس سلسلے میں ناصر کاظمی، شکیب جلالی، سلیم احمد، ظفر اقبال، منیر نیازی اور اقبال ساجد بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

ہم عصر شعراء کی شعری تصویریں دیکھنے کے بعد جب ہم ساجد کی آرٹ گیلری میں داخل ہوتے ہیں تو آنکھوں کو ایک دم ایک طرح کی تازگی اور انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ ساجد کی تمثالوں کے پیچھے کوئی نہ کوئی نفسیاتی یا روحانی واردات پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ تصویریں زندگی کی قوت اور حرکت سے برقائی گئی ہیں۔ ساجد کا کمال یہ ہے کہ وہ اجنبی تصویروں میں مانوس عنصر ڈال دیتا ہے اور مانوس تصویروں میں حیرت کے عناصر شامل کر کے ایک پُراسراریت سی پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی تصویریں بیک وقت عناصرِ اربعہ اور حواسِ خمسہ سے متعلق ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے ساجد کی تصویریں اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ مانوس، خوبصورت متحرک اور قابلِ مطالعہ ہیں۔

دہر کے اندھے کنویں میں کس کے آوازہ لگا
کوئی پتھر پھینک کے پانی کا اندازہ لگا

ممکن ہے دُھول جھونک کے سورج کی آنکھ میں
ذرّے کا ہاتھ میان سے شمشیر کھینچ لے

ساجد کی شعری تصویروں کے بعد جو چیز قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کی نئی نئی علامات، نادر تشبیہات اور تازہ اور خوبصورت استعارات ہیں۔ ساجد در حقیقت ایک ایسا شاعر ہے جس نے مضامین سے لیکر ردیف، قافیئے، بحر، زمین، لہجے، آہنگ اور اظہار غرض ہر سطح پر غزل کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا۔ وہ اپنے بہت سے ہم عصر شعراء کی طرح گھسے پِٹے استعارات استعمال کرنے کے بجائے نئے استعارے تخلیق کرتا ہے۔ دراصل وہ ایک ایسا منفرد شاعر تھا جو کسی کے پیچھے چلنے کے بجائے آگے چلنا پسند کرتا تھا۔ اس نے اردو غزل کو بہت سے نئے اور تازہ استعارے دیئے۔ یہ استعارے نئے ہونے کے باوجود بھی اجنبی نہیں لگتے کیونکہ اس نے یہ استعارے ہماری روزمرہ زندگی سے اخذ کئے ہیں۔

کیا لطف اوڑھنے میں پرانے لحاف کو
اس کے بدن کی رُوئی سے گرمائی چھن گئی

ساجد نے ہر سطح پر ندرت اور تازگی کا مظاہرہ کیا۔ اس کی انفرادیت کو بڑے بڑے شاعروں نے تسلیم کیا ہے۔ ایک خاص قسم کی انفرادیت ہی اس کی غزل کی پہچان ہے۔ وہ معمولی چیز کو اس زاویئے سے دیکھتا ہے کہ وہ غیر معمولی نظر آنے لگتی ہے۔

جس طرح ہر شاعر کے چند مخصوص استعارے ہوتے ہیں جن سے اس کا مرکزی لہجہ ترتیب پاتا ہے اسی طرح ساجد نے بھی بعض استعاروں کو بار بار برتا ہے۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ کبھی کبھی وہ ایک ہی استعارے کو نئے نئے انداز اور تخلیقی تازگی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

میں اپنے جسم کی بوری کو ٹھوکریں ماروں
مگر یہ شغلِ اذیّت پسند آئے مجھے
آنکھ کے پتھر کو پھر اشکوں کی دیمک لگ گئی
عین ممکن ہے جگہ یہ سنگِ جامد چھوڑ دے

آیئے اب ساجد کی مخصوص علامات کو دیکھتے ہیں۔ اس نے اپنے استعاروں کی طرح علامات تخلیق کرنے میں بھی بڑی تازگی، پختگی اور تخلیقی سنجیدگی سے کام لیا ہے۔ وہ اپنی علامات براہِ راست اپنے ماحول اور عصری زندگی سے اخذ کرتا ہے۔ اس نے ہماری معاشرتی، تہذیبی، سیاسی اور مذہبی زندگی کے مختلف رنگوں اور بہت سی معاشرتی کمزوریوں کا رس نکال کر ان علامات میں محفوظ کر لیا ہے۔ ساجد کی یہ علامتیں ہماری زندگی کے مختلف رویّوں کی ترجمانی اور وضاحت کرتی ہیں۔ علامت سازی میں اس نے نہ صرف نئے پن کا ثبوت دیا بلکہ ان نئی علامتوں کے ساتھ لوگوں کے جذباتی و احساساتی ردِّعمل کو بھی وابستہ کیا۔ یہ کام اگرچہ مشکل تھا، لیکن ساجد کی جدّت پسند طبیعت نے اس چیلنج کو بھی پورا کر دکھایا۔ آیئے اب ساجد کی مخصوص سماجی و تہذیبی پس منظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ ساجد کی بہت سی علامتوں میں سے "گھر" ایک مرکزی علامت ہے۔ یہ ایک ایسا گھر ہے جو اندرونی اور بیرونی طور پر انتشار کا شکار ہے اس گھر کے باسی ایک ہی چار دیواری میں رہتے ہوئے بھی جزیروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کے درمیان خوشی، غم، ایثار، قربانی اور دُکھ درد کے سارے رشتے منقطع ہو چکے ہیں۔ گھر کا ہر فرد اپنی خود غرضانہ خواہشات کی تکمیل کے لئے اس کی دیواریں توڑ کر اس کا ملبہ تک فروخت کرنے پر آمادہ ہے۔ اس گھر کا تعلق آس پاس کے گھروں سے ٹوٹ چکا ہے اور اس گھر کے باسی نہ صرف معاشی سطح پر مفلسی کا شکار ہیں، بلکہ وہ روحانی طور پر بھی کنگال ہو چکے ہیں۔ ساجد کا یہ "گھر" اس کے اپنے گھر سے لے کر قومی اور پھر بین الاقوامی گھر کی توڑ پھوڑ، معاشی حالت، تنہائی اور انتشار کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں
لہو سے جو اُٹھائی تھیں وہ دیواریں نہیں اپنی
یہی محسوس ہوتا ہے پرائے گھر مین رہتے ہیں

ایسے گھر میں رہ رہا ہوں دیکھ لے بے شک کوئی
جس کے دروازے کی قسمت میں نہیں دستک کوئی

گھر سے ملتا جُلتا ایک اور استعارہ ''شہر'' ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس کے اندر ساجد کا ''گھر'' واقع ہے جو انتشار خود غرضی، تنہائی، تشدّد اور بیگانگی اس ''شہر'' کا مزاج ہے، وہی سب کچھ اس شہر کے اندر آباد ہر گھر میں نظر آتا ہے، لہٰذا اس گھر اور شہر کے درمیان بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ شہر بھی ساجد کے گھر کی طرح صرف اسی کا شہر نہیں بلکہ یہ بھی ہماری قومی بلکہ بین الاقوامی زندگی کے تمام رجحانات اور رنگوں کا احاطہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

کبھی بیداریاں قسمت تھیں اب نیندیں مقدّر ہیں
ہمارا کیا ہے ہم تو شہرِ خواب آور میں رہتے ہیں
غربت کی تیز آگ پہ اکثر پکائی بُھوک
خُوشحالیوں کے شہر میں کیا کچھ نہیں کیا

''سانپ'' ساجد کی ایک اور اہم علامت ہے جسے وہ بیک وقت استحصالی گروہ اور دوستوں کے بھیس میں چھُپے ہوئے دشمنوں کے لئے استعمال کرتا ہے۔ استحصالی طبقہ سانپ کی طرح کمزور لوگوں کے مفادات اور حقوق کو مسلسل ڈس رہا ہے اور ان کی خود غرضی، فریب اور مکّاری کا زہر آہستہ آہستہ معاشرے کے جسم میں سرایت کر رہا ہے۔ یہ سانپ کہیں طاقتور دشمنوں کے رُوپ میں اور کہیں دوست نما دشمنوں کی صف میں ہمارے اردگرد لپٹے ہوئے ہیں۔ ساجد کے نزدیک سانپوں کے زہر سے بچنے کا ایک ہی تریاق ہے اور وہ ہے ''ماں کی دعا'' وہ کہتا ہے

آہ پُھنکار کی مانند گھروں سے نکلی
کوئی بھی گھر نہ یہاں سانپ سے خالی نکلا
خوف آیا نہیں سانپوں کے گھنے جنگل میں
مجھ کو محفوظ مری ماں کی دعا نے رکھا

ساجد نے جس علامت کو اپنی شاعری میں سب سے زیادہ استعمال کیا ہے وہ ہے خون یا لہو کی علامت۔ اس کے ہاں خون کی علامت کی کئی سطحیں ہیں۔ خون کہیں انقلاب یا تبدیلی کی علامت ہے۔ کہیں محنت اور جدوجہد کا مفہوم لئے ہوئے ہے، کہیں کہیں وہ خون کی علامت کے ذریعے اپنے زمانے کے تشدّد اور قتل وغارت گری کے رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔ خون کی علامت کا تہذیبی و سماجی پس منظر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ساجد نے قیامِ پاکستان کے وقت کھیلی جانے والی خون کی ہولی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس کے بعد بھی ہمارے معاشرے میں انسانی خون کی ارزانی اب عام ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں ہونے والی جنگیں، تشدّد کی کارروائیاں، بموں کے دھماکے، زمینی اور خلائی حادثے جن میں آئے دن انسانی خون بہتا ہے، شاید ان سب

باتوں نے مل کر ساجد کے مزاج اور طبیعت پر گہرے اثرات مرتب کیے ہوں۔ لہٰذا اسی لئے اس کی غزلوں میں انسانی خون کے چھینٹے جگہ جگہ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

وہ سطحِ گنگ و جمن پھر سے ہو گئی رنگین
لہو سے سرخ ہوئی ساحلوں کی کائی دیکھ
مرے ہی منہ کو مرا خون لگ چکا ہے یہاں
مرے سوا کوئی قاتل نظر نہ آئے مجھے
ہسپتالوں میں یہ کاروبار بھی کرنا پڑا
مجھ کو اپنے خون کا بیوپار بھی کرنا پڑا

"سورج" خون کے بعد ساجد کی غزل میں دوسری بڑی علامت ہے۔ سورج کے ساتھ معانی کی کئی سطحیں وابستہ ہیں۔ کہیں وہ زندگی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں روشنیاں بانٹتا ہے۔ کہیں وہ فرد کے فنی اور تخلیقی جوہر کی علامت ہے، بعض جگہوں پہ ساجد اسے جدوجہد اور انقلاب کے حوالے سے پیش کرتا ہے اور کہیں کہیں سورج ظلم کی علامت بھی بن جاتا ہے۔

جس میں بھرا تھا زہر، وہ سورج رفو کیا
یہ غم نہیں کہ آنکھ سے بینائی چھن گئی
نکلیں چراغ ہاتھ میں لے کر گھروں سے لوگ
سورج کی رہ میں منزلِ ظلمت بھی آئے گی

اسی طرح "چاند" کی علامت، جو بیک وقت روشنی، خوبصورتی، جذبہ، پاگل پن، محبت اور ٹھنڈک کی علامت ہے۔ چاند کی علامت ساجد کے ہاں اس لئے بھی اہم ہے کہ اس سے بظاہر کھردرے اور بیزار نظر آنے والے ساجد کی زندگی کے لطیف، خوبصورت اور نرم گوشوں کی عکاسی ہوتی ہے۔

تمام لوگ گھروں کی چھتوں پہ آ جائیں
بڑی کشش ہے نئے چاند کے نظارے میں
رُخِ روشن کا روشن، ایک پہلو بھی نہیں، نکلا
جسے میں چاند سمجھا تھا، وہ جگنو بھی نہیں نکلا

اسی طرح "جگنو" کی علامت کے ساتھ روشنی، خودانحصاری، خودی اور راہنمائی کے احساسات وابستہ ہیں۔

دن کو کرنیں رات کو جگنو پکڑنے کا ہے شوق
جانے کس منزل پہ لے جائے گا پاگل پن مجھے

ساجد کی شاعری میں نئی شہری زندگی کی تمثالیں اور علامتیں بھی ہیں۔ مثلاً ''فٹ پاتھ'' علامت ہے' بے گھری' غریب الوطنی' مسافرت اور بے سرو سامانی کی' ساجد کی اپنی زندگی کو سمجھنے کے لئے فٹ پاتھ کی علامت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

رات فٹ پاتھ پہ دن بھر کی تھکن کام آئی
اس کا بستر بھی کیا سر پہ بھی تانے رکھا

ساجد کے ہاں ''کشکول'' غربت' تساہل پسندی' تہی دامنی اور نچلے طبقے کی محرومیوں کی علامت ہے۔

چڑھتے سورج نے ہر اک ہاتھ میں کشکول دیا
صبح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سوالی نکلا

ساجد کی ان مخصوص علامتوں کے مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ساجد نے علامت سازی میں دو طرح کا کام کیا۔ ایک تو بالکل نئی علامتیں تخلیق کیں اور دوسرے نمبر پر پرانی علامتوں کے ساتھ نئے معانی و مطالب کو وابستہ کیا۔ یوں ساجد نے اپنی تمثالوں' علامتوں تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعے غزل کو ایک نیا اسلوب دینے کی کوشش کی جس میں وہ بہت حد تک کامیاب رہا۔

جہاں تک ساجد کی شعری زمینوں کا تعلق ہے یہ زمینیں اتنی زرخیز' نئی اور بعض اوقات اتنی مشکل ہوتی ہیں کہ جدید اردو غزل میں شکیب جلالی کو چھوڑ کر زمینوں کا اتنا تنوع کسی دوسرے شاعر کے ہاں کم ہی نظر آئے گا۔ ساجد کے ہم عصروں میں ظفر اقبال اگرچہ بڑے اختراعی ذہن کے شاعر ہیں لیکن ان کی زمینوں میں خشکی اور نامانوسیت کا احساس بھی ملتا ہے۔ بعض اوقات ظفر اقبال کی بحریں بڑی متحرک اور خوبصورت بھی ہوتی ہیں' لیکن زمین میں صرف بحر ہی شمار نہیں ہوتی بلکہ زمین' بحر' قافیے اور ردیف تینوں چیزوں سے مل کر بنتی ہے۔ اگر نئی اور خوبصورت زمینوں میں اعلیٰ خیالات و افکار پیش نہ کئے گئے ہوں تو اس سے بھی شعرِ اعلیٰ شعر نہیں بن پاتا۔ جو چیز ساجد کو ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ نئی زمینوں کی تخلیق کے ساتھ ساتھ وہ ان میں جدید اور اعلیٰ خیالات بھی پیش کرتا ہے۔ یہ ساری باتیں مل کر ساجد کی زمینوں کو حسن اور رنگارنگی بخشتی ہیں۔ دراصل زمین کی تشکیل کا تعلق براہِ راست شاعر کے مزاج سے ہوتا ہے۔ بڑا شاعر نہ صرف خیالات بلکہ فن کے تمام پہلوؤں میں اپنی انفرادیت' تازگی اور بڑے ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ ساجد بظاہر ایک کم پڑھا لکھا شاعر تھا لیکن ایجاد و اختراع کی قوت و صلاحیت اس کی ذات میں بڑے بڑے عالم شعراء سے کہیں زیادہ تھی۔

ساجد زمین کی تشکیل کے سلسلے میں اس قدر جدت پسند تھا کہ بڑے بڑے شاعر اس کی زندگی ہی میں اس کی زمینوں میں شعر کہنا خوبی سمجھتے تھے۔ ادھر اس کی کوئی تازہ غزل کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہوتی' ادھر شعراء اس زمین میں سینکڑوں غزلیں لکھ ڈالتے۔ اس سلسلے میں وہ اتنا منفرد تھا کہ اس نے نہ صرف اپنے ہم عصروں کو متاثر کیا بلکہ اس کے جونیئر اور سینئر شعراء بھی اپنے آپ کو اس کے اثرات سے نہیں بچا پائے۔

ساجد کی اکثر زمینیں تخلیقی امکانات سے مالا مال ہوتی ہیں، لیکن کبھی کبھی وہ ایسی سنگلاخ زمین نکالتا ہے کہ عام شاعر اس میں ایک دو اشعار سے زیادہ شعر نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ساجد ایسی زمینوں میں بھی بڑی سہولت کے ساتھ بیس بیس شعر کہہ دیتا ہے۔ اس کی اس قسم کی زمینوں کو دیکھ کر انشاء مصحفی، سودا، ذوق اور نظیر یاد آجاتے ہیں۔ چند اشعار

بدن پہ میل اور چہرے پہ گردِ راہ کا رہنا
کوئی رہنا یہاں ہے شخص بے تنخواہ کا رہنا

چپکے سے آکے دھیان کی زنجیر کھینچ لے
خوابوں کی چھت سے وہم کے شہتیر کھینچ لے

کیا ملا اقبال ساجد ندرتِ فن بیچ کر
اب گزر اوقات کر دانتوں کا منجن بیچ کر

ساجد کے فن کے مطالعہ میں اس کی زبان خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ زبان جدید غزل میں نئی ہونے کے باوجود اجنبی اور غیر شاعرانہ محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ساجد نے جدید غزل کی زبان کسی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر تشکیل نہیں دی بلکہ اس کی غزل کی زبان کے سوتے در حقیقت ہماری روایتی غزل ہی سے پھوٹتے ہیں۔ ساجد کا کمال یہ ہے کہ اس نے نہ صرف غزل میں نئے الفاظ کا اضافہ کیا بلکہ ان الفاظ کے اندر چھپے ہوئے امکانات کو اس طرح شعری تجربے کا حصہ بنایا کہ یہ الفاظ اس کی زندگی ہی میں غزل کے معروف الفاظ قرار پا گئے۔

ساجد نے جس عہد میں غزل لکھنی شروع کی اس وقت دو طرز ہائے زندگی ایک دوسرے سے الگ ہو رہے تھے۔ جب سوسائٹی میں تبدیلی کا عمل اتنا تیز ہو تو فن..... جو کہ معاشرے ہی کی پیداوار ہوتا ہے..... اس سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا ہے؟ لہٰذا ساجد کے لئے غزل میں شدید تبدیلیوں اور زبان کی دریافت کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

ساجد نے اپنی غزل میں ان تمام نئے الفاظ کو بے دریغ برتا جو نئی زندگی کے بنیادی الفاظ ہیں۔ وہ نئی لفظیات سے کام لے کر اچھی شاعری کے لئے راہ ہموار کر رہا تھا۔ وہ کم پڑھا لکھا تھا، مگر غزل کو نئی زبان دے رہا تھا۔ غزل کی زبان کے سلسلے میں اس نے کسی خاص شاعر کا رنگِ سخن اختیار کرنے یا تقلید کے بجائے اظہار کی نئی راہیں تراشیں۔ اسے لفظوں کے استعمال اور معنی کی مختلف جہتوں سے آشنائی حیرت انگیز حد تک تھی۔

بہت سے دیگر جدید شعراء نے بھی نئے نئے لفظوں کو غزل کے پیراہن پر ٹانکنے کی کوشش کی ہے لیکن ایسی کوششیں بہت کم ثمرور ہوئی ہیں اور اکثر و بیشتر یہ الفاظ غزل کے مخصوص مزاج کا حصہ نہیں بن پاتے۔ اس کے برعکس ساجد کا فنی کمال یہ ہے کہ اس نے نئے الفاظ کو ایسی فنی پابکدستی کے ساتھ برتا ہے کہ ایسے لگتا ہے

۔ یہ الفاظ سالہا سال سے غزل میں استعمال ہوتے چلے آرہے ہیں۔ مثال کے طور پر چائے، پیالی، بدمعاش، فیشن، پڑوسی، تپ دق، رِچق، شال، گالی، گھاس، گاہک، دیمک، دولہا، سیڑھی، پیتل، لاٹھی، تاڑی، ینہ حسن، کھلاڑی، جھاڑی، پھُلواڑی، کھیتی باڑی، گھڑا، لحاف، چھاپہ خانہ، جیل، بوری، اشتہار، مداری، پٹارہ وراینٹ جیسے الفاظ اگرچہ ہماری روزمرّہ زندگی میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں لیکن ضروری نہیں کہ جو الفاظ ہماری روزمرّہ زندگی میں شامل ہوں وہ غزل کے دامن میں بھی جگہ پائیں؟ بہت سے شعراء نے ایسے الفاظ کو غزل میں استعمال کرتے ہوئے ٹھوکریں کھائی ہیں، لیکن اقبال ساجد نے اس قسم کے الفاظ کو جس خوبصورتی اور فنّی مہارت سے ساتھ استعمال کر کے غزل کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کیا ہے یہ صرف اسی کا حصہ ہے۔ مثلاً

چائے کی پیالی پہ ہاں میں ہاں ملانا پڑ گئی
دوستوں میں خود کو برخوردار بھی کرنا پڑا

شہر کے باغ میں ہو جائے ملاقات تو پھر
کون گلیوں میں رُکے، کون پسِ چِق ٹھہرے

سرخ لہو سے یہ پھُلواڑی کرتا ہوں
میں لفظوں کی کھیتی باڑی کرتا ہوں

اسی طرح غزل میں انگریزی الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں بھی جدید شعراء ہمیشہ افراط و تفریط کا شکار رہے ہیں۔ بعض نقّاد اردو غزل میں انگریزی الفاظ کے استعمال پر بڑے برہم دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ غزل کو ان الفاظ سے پاک رکھنے کے لئے کیا غزل کے آگے بند باندھا جا سکتا ہے؟ یقیناً ایسا ممکن نہیں کیونکہ انگریزی معاشرے کی ایجادات.......... جن کے نام بھی انگریزی ہیں.......... جس تیزی کے ساتھ ہماری عصری زندگی میں شامل ہو رہی ہیں اتنی ہی تیزی کے ساتھ یہ ادب اور زبان کا بھی حصّہ بن رہی ہیں لہٰذا انہیں ادب میں شامل کئے بِن کوئی چارہ نہیں۔ انگریزی زبان کے الفاظ کے بارے میں بھی ساجد اور اس کے ہم عصروں میں ایک بنیادی فرق ہے وہ یہ کہ بعض جدید شاعر انگریزی الفاظ کو فیشن کے طور پر غزل میں برتتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے انگریزی کے کسی لفظ کو محض شعر میں پرونے کے لئے شعر کہا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے لکھنوی شعراء صنعت گری کے لئے شعر کہتے تھے جبکہ ساجد انگریزی کے صرف انہی الفاظ کو غزل میں استعمال کرتا ہے، جن کے یا تو اردو زبان میں مناسب نعم البدل نہیں ہوتے یا پھر وہ الفاظ ہماری تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں اتنے رچ بس چکے ہیں کہ اب وہ اردو زبان کا حصّہ بن چکے ہیں۔ چند اشعار

میں نے لوگو اپنی سوچوں کی سمگلنگ آپ کی
جُرم جب عائد ہوا انکار بھی کرنا پڑا

رات فٹ پاتھ پہ دن بھر کی تھکن کام آئی
اس کا بستر بھی کیا، سر پہ بھی تانے رکھا

قتل ہو جائے گا' ڈکٹیٹر نہ بن ضد چھوڑ دے
چھوڑ دے تختِ سخن اقبال ساجد چھوڑ دے
دوستوں کے جرم اپنے نام لکھوانا پڑے
دوستو! روٹی کی خاطر جیل بھی جانا پڑا

مندرجہ بالا اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساجد نے انگریزی الفاظ کو کتنی احتیاط اور تخلیقی سنجیدگی کے ساتھ استعمال کیا ہے

ساجد کی غزل کی زبان میں الفاظ کے تین دھارے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ نمبر 1 ہندی الفاظ نمبر 2 فارسی الفاظ نمبر 3 انگریزی الفاظ ان تینوں دھاروں کے ملاپ بلکہ سنگم پر وہ غزل جنم لیتی ہے جو ساجد کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔

اردو غزل پر ہمیشہ سے فارسی زبان واسالیب کے اثرات بہت گہرے رہے ہیں' لیکن اقبال ساجد کے ہاں ارادی یا غیر ارادی طور پر ہندی الفاظ کا استعمال فارسی کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ مثلاً گاہک' پیٹر' دیمک' سرہانے' سانپ' مُٹھی' جگنو' سیڑھی' سونا' پیتل' آنچ' گھنگرو' لاٹھی' گھڑا' پُھلواڑی' چکنا' روٹی' رُوئی' چھتری' جانور' پگڑی' بوری' کوڑی' پٹاری' اینٹ' پتھر' گالی' کھڑکی' پیالی' ہاتھ' آنکھ' کاجل' کسوٹی' آنگن' تھکن' بسیرا' بستی' باسی' سورج' سویرا' رُوپ' چال' دھنک' پڑوسی' بھیڑ' سڑک' کانچ' لہو' آگ اور پانی جیسے الفاظ نہ صرف ہندی ہیں بلکہ یہ اس کی غزل کی بنیادی لفظیات ہے۔

جہاں تک فارسی اثرات کا تعلق ہے۔ یہ اثرات اگرچہ ہندی کی نسبت کم ہیں لیکن فارسی لفظیات کی مٹھاس نے ساجد کی غزل کو وہ شیرینی بخشی ہے جو جدید شعراء میں سے بہت کم کے حصّے میں آئی ہے۔
آیئے اب اقبال ساجد کی چند خوبصورت تراکیب دیکھتے ہیں۔ مثلاً کارِ فکروفن' طوقِ شکست' اسبابِ خرد' طوافِ مہ وانجم' جشنِ نعمت' طریقِ حسنِ خشوع وخضوع' بحرِ شب' بازارِ رنگ وبُو' خوئے قناعت' دعوتِ اوراقِ گُل' کتابِ خاک' بنیادِ فصیل ودر' شہرِ خواب آور' خوشبودار چہرے' کربِ ثمر آور' صبحِ حنارنگ اور شوقِ نقلِ مکانی جیسی خوبصورت اور تخلیقی امکانات سے بھرپور تراکیب اس کی غزل کے حسن کو دوآتشہ کر دیتی ہیں۔
جہاں تک انگریزی اثرات کا تعلق ہے یہ صرف الفاظ کی حد تک ہے کیونکہ اقبال ساجد صرف غزل کا شاعر ہے اور غزل کے اپنے مخصوص تقاضے ہیں۔ انگریزی ادب اور غزل کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہاں البتہ ساجد نے سمگلنگ' فٹ پاتھ' پلاسٹک' شوکیس' جیل' ڈکٹیٹر' کیش' کرنسی' پوسٹر' تھیٹر' جوکر اور انجکشن جیسے الفاظ غزل کے دامن میں ٹانک کر غزل کی لفظیات کے کینوس کو وسیع کرنے کا ایک تجربہ کیا ہے جس میں وہ کم از کم اپنے ہم عصروں سے زیادہ کامیاب نظر آتا ہے۔
مختصر یہ کہ ساجد کی شعری زبان ہندی' فارسی اور نگریزی الفاظ واسالیب سے مل کر تشکیل پاتی ہے اور یوں

ان تینوں زبانوں کے الفاظ کے ملاپ کے نتیجے میں وہ زبان وجود میں آتی ہے جس کے باعث ساجد جدید غزل کا ایک اہم 'نمائندہ اور رجحان ساز شاعر قرار پاتا ہے۔

جہاں تک اقبال ساجد کی غزل کے لہجے کا تعلق ہے اس کا لہجہ بہت سے لہجوں سے مل کر ترتیب پاتا ہے۔ ساجد کی غزل کو غور کی آنکھ سے پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اس کے لہجے پر میر' غالب' سودا' یگانہ' اقبال اور شاد عارفی کے اثرات کتنے گہرے ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ اثرات اقبال ساجد نے شعوری طور پر قبول کئے ہوں۔ بلکہ بڑے شعراء کے اثرات غیر محسوس طریقے سے بعد میں آنے والوں پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور ہر بڑا شاعر اپنے سے پہلے گذرنے والے بڑے شعراء کے کاندھوں پر کھڑا ہوتا ہے۔

ساجد کے لہجے پر جہاں تک میر کے لہجے کے اثر کا تعلق ہے اقبال ساجد نے زندگی میں مہذّب پن اور خوش سلیقگی کے اثرات میرے سے قبول کئے ہیں۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

پھینک یوں پتھر کہ سطح آب بھی بوجھل نہ ہو
نقش بھی بن جائے اور دریا میں بھی ہلچل نہ ہو
کھول یوں مٹّھی کہ اک جگنو نہ نکلے ہاتھ سے
آنکھ کو ایسے جھپک لمحہ کوئی اوجھل نہ ہو

اسی طرح ساجد کے مزاج میں جو اکّھڑپن اور طنطنہ ہے وہ سودا کے مزاج سے زیادہ قریب ہے۔ مثال کے طور پر یہ

ریزگی کا ڈر ہے تو ہٹ جائے میری راہ سے
خود بخود رستہ مرا ہر سنگِ جامد چھوڑ دے
چُپ کس لئے ہے اینٹ کا پتھر سے دے جواب
حق چاہیئے تو میان سے شمشیر کھینچ لے

ساجد کے مزاج میں دُکھوں کے درمیان بھی خود کو قائم رکھنے کا جو حوصلہ ملتا ہے وہ غالب کی دین ہے' لیکن ساجد کے اندر غالب جیسی وہ زندہ دلی نہیں ہے جس کے تحت غالب تمام تر غموں اور دکھوں کے باوجود ان غموں کو ایک قہقہے میں اُڑا دیتا ہے اور غالب دوسروں پر ہنسنے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی اپنی ذات پر بھی قہقہہ لگانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ ساجد کا شعر ہے

حوصلہ قائم رکھا گھر کے دُکھوں کے درمیان
دل کا آئینہ کسی بھی حال میں ٹوٹا نہیں

اسی طرح وسیع المشربی کی سوچ بھی اقبال ساجد نے غالب ہی سے مستعار لی ہے' وہ کہتا ہے

ہمارا دل تو ہے انسانیت کا گہوارہ
بسے ہوئے ہیں جہاں شیخ بھی برہمن بھی

ایک تیسری چیز جو اقبال ساجد نے براہِ راست غالب سے حاصل کی ہے' وہ ہے شعری اَنا کا بے پناہ احساس۔ وہ کہتا ہے

عہدِ جدید تر کا نمائندہ کون ہے
گر میں نہیں تو اور یہاں زندہ کون ہے
فراق و فیض و ندیم و فراز کچھ بھی نہیں
نئے زمانے میں ان کا جواز کچھ بھی نہیں

سماجی و عصری شعور' مزاج میں ایک خاص طرح کی بیزاری اور اُکتاہٹ' ذات کا شدید احساس اور عشقیہ مزاج کی خشکی یہ تمام اثرات ساجد نے یگانہ سے قبول کیے ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ساجد پر سب سے زیادہ اثرات یگانہ کے ہیں تو شاید بے جا نہ ہو گا۔ چند مثالیں دیکھیے۔

میں اپنے جسم کی بوری کو ٹھوکریں ماروں
مگر یہ شغلِ اذیّت پسند آئے مجھے
رنگ پر آئی ہوئی ہے اب جنوں خیزی میری
رات دن توہینِ اربابِ خرد کرتا ہوں میں
گُلاب کوئی بھی مارے تو مُشتعل ہو جاؤں
کہ رنگ و نور کی بارش بھی اب جلائے مجھے

اقبال ساجد کے ہاں سماجی حقائق کا جو اتنا شدید اور گہرا مشاہدہ ملتا ہے اور ان کے خلاف وہ جس طرح ردِ عمل ظاہر کرتا ہے' یہ سارا یگانہ کا مزاج ہے جو ساجد پر اثر انداز ہوا' اس کی وجہ یہ ہے کہ ساجد اور یگانہ کے سماجی حالات اور مسائل میں بہت زیادہ مماثلتیں نظر آتی ہیں۔

ہائے رے حالات اک مہمان لوٹانا پڑا
میں نہیں گھر پہ یہ بچّے سے کہلوانا پڑا
اب تو دروازے سے اپنے نام کی تختی اُتار
لفظ ننگے ہوگئے شہرت بھی گالی ہو گئی

اسی طرح ساجد کے لہجے میں عرفانِ ذات' عظمتِ ہستی اور یقین کا جو احساس ملتا ہے' یہ اقبال کے اثرات ہیں

خلاء کے آر بھی ہوں میں' خلاء کے پار بھی ہوں میں
عبور اک پل میں ہو جائے حدودِ مُمکنات اپنی
جیوں گا اپنی مرضی سے، مروں گا اپنی مرضی سے
مرے اپنے تسلط میں ہے' موت اپنی حیات اپنی

قبال ساجد کے لہجے میں جو ایک خاص قسم کا تنقیدی شعور اور سماجی و معاشرتی ناہمواریوں پر کٹیلے انداز میں طنز ...ور رجحان ملتا ہے یہ اثرات ساجد نے شاد عارفی سے قبول کئے ہیں۔ ساجد کی ساری شاعری پر یہی کٹیلا، طنزیہ اور ...تد نہ ہجہ غالب ہے بلکہ اگر سچ کہا جائے تو ساجد کا لہجہ ہے ہی اسی کٹیلے پن پر مشتمل جو غزل میں نیا ہونے کے باوجود ...عارفی سے مُستعار ہے چند مثالیں

شہر کے باغ میں ہو جائے ملاقات تو پھر
کون گلیوں میں رُکے، کون پسِ چق ٹھہرے

چلتے پھرتے تھیٹروں میں ایک جوکر کی طرح
ہنسنے رونے کا مجھے کردار بھی کرنا پڑا

جانور کی کھال پہنی اور چلا پنجوں کے بل
بن گیا بہُروپیا بازار میں آنا پڑا

صاحب اگر ہیں آپ تو سب آپ کے غلام
ہر شے ملے گی حسب ضرورت کرائے پر

یوں ان تمام شاعروں کے لہجوں کے سنگم پر اقبال ساجد کا لہجہ جنم لیتا ہے۔ اس کی آواز، آوازوں کے ہجوم ...میں ...پنی الگ شناخت اور انفرادیت قائم رکھے ہوئے ہے۔ اگر چہ ساجد نے مذکورہ بالا شعراء کے اثرات قبول کئے، ...ن یہ اثرات اخذ و انجذاب تک محدود ہیں۔ اس نے نہ ہی کبھی کسی شاعر کی تقلید کی شعوری کوشش کی اور نہ ہی ...ن کے اندر شعوری تقلید کا مادہ تھا بلکہ یہ اثرات نہایت غیر محسوس طریقے سے ساجد کے لہجے پر اثر انداز ہوئے ...یں، لیکن پھر بھی ساجد نے ان اثرات کو اپنانے میں مقلدانہ رویئے کی بجائے مجتہدانہ اُسلوب اختیار کیا ہے اور یوں ...جد کی آواز، ان تمام آوازوں میں مل کر ہی اپنی الگ شناخت کو برقرار رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساجد اپنے ...ضامین، اسالیب، طرزِ احساس، آہنگ، زبان و بیان اور لہجے کے اعتبار سے اپنے ہم عصر شعراء کی صفِ اوّل میں ...نظر آتا ہے۔ وہ ایک ایسا شاعر ہے جس کی آواز کو ایک لمبے عرصے تک یاد رکھا جائے گا اور اردو غزل آئندہ ...و بھی رنگ بدلے گی، جو بھی کروٹ لے گی، اقبال ساجد اردو غزل کے ماتھے کا جھومر قرار پائے گا۔

جواز جعفری

یکم ستمبر 1990ء

حمد

تیرے علاوہ دہر میں واحد نہیں کوئی
ہر شے کی ضد ہے اور تری ضد نہیں کوئی

نعت

میں جس جانب بھی دیکھوں حُسنِ پیغمبرؐ نظر آئے
وہی مرکز نظر آئے، وہی محور نظر آئے

تری تعریف کو تو پھول ایسے لفظ لکّھے تھے
جو دیکھا غور سے تو چاند کاغذ پر نظر آئے

زمانہ آج تک اس روشنی کی کاشت کرتا ہے
جو تُو نے بوئی تھی وہ فصل اب گھر گھر نظر آئے

جو دیکھا چشمِ بینا سے تو تیرا نام لکھا تھا
فلک کی بستیوں میں جتنے بام و در نظر آئے

سُبک رَو کشتیوں نے جب بھی تیرے گیت گائے ہیں
نشیبوں میں جو دریا تھے بُلندی پر نظر آئے

مہک کر پھُول شب کو تیرے ہونے کی گواہی دے
چمک کر چاند تیرے حُسن کا مظہر نظر آئے

سمندر کا چلن اپنا کے جس جانب چلا ساجد
خروشِ آب میں اس کو ترے تیور نظر آئے

نعت

آپ کی یادوں کا دامن ہاتھ سے چھُوٹا نہیں
ذہن بھی بکھرا نہیں دل بھی مرا ٹوٹا نہیں

کون کہتا ہے مری آنکھیں کھنڈر ہو جائیں گی
جب کسی بھی شخص کی بینائی کو لُوٹا نہیں

جی رہا ہوں آج بھی اک تمکنت کے ساتھ میں
میرے آقا بخت میرا آج تک پھُوٹا نہیں

حوصلہ قائم رکھا گھر کے دُکھوں کے درمیاں
دل کا آئینہ کسی بھی حال میں ٹوٹا نہیں

آپ نے آباد کیں جو نیکیوں کی بستیاں
ان میں سچّے لوگ رہتے ہیں کوئی جھُوٹا نہیں

سلام

یا ربّ دکھا دے ایک جھلک اُس شہید کی
جس نے لہو پہن کے محرّم میں عید کی

تُو نے صداقتوں کا نہ سودا کیا حسینؑ
باطل کے دل میں رہ گئی حسرت خرید کی

ماتم سرائے دہر میں، ایسے بھی لوگ ہیں
نامِ حسینؑ لب پہ ہے، خُو ہے یزید کی

○

جب ہوئی رائے شماری سبھی صادق ٹھہرے
ایک ہم تھے کہ جو بستی میں منافق ٹھہرے

شہر کے باغ میں ہو جائے ملاقات تو پھر
کون گلیوں میں رُکے، کون پسِ چق ٹھہرے؟

آج کے دن بھی مرا رزق نہ مجھ پر اُترا
آج کے دن بھی پڑوسی مرے رازق ٹھہرے

کوئی چاہے کہ نہ چاہے نہیں پروا، ان کو
خود ہی معشوق ہوئے، خود ہی وہ عاشق ٹھہرے

خواہشِ اُلفت و شفقت سے ہوئے ہیں محروم
اِن یتیموں کے لئے کوئی تو مُشفق ٹھہرے

نہ کوئی دِین تھا اُس کا، نہ کوئی مذہب تھا
دِلِ مُردہ کے لواحق، نہ لواحق ٹھہرے

گردشِ خوں پہ ہے جب گردشِ دوراں کا اثر
کیوں نہ ساجدؔ تنِ لاغر میں تپِ دِق ٹھہرے؟

ادبِ لطیف ص 88 شمارہ 8- 7- 1984ء

○

غار سے سنگ ہٹایا تو وہ خالی نکلا
کسی قیدی کا نہ کردار مثالی نکلا

چڑھتے سورج نے ہر اک ہاتھ میں کشکول دیا
صبح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سوالی نکلا

سب کی آنکھوں میں تری شکل نظر آئی مجھے
قرعۂ فال مرے نام پہ گالی نکلا

راس آئے مجھے مرجھائے ہوئے زرد گلاب
غم کا پرتو مرے چہرے کی بحالی نکلا

کٹ گیا جسم مگر سائے تو محفوظ رہے
مرا شیرازہ بکھر کر بھی مثالی نکلا

رات جب گزری تو پھر صبح حنا رنگ ہوئی
آسماں جاگی ہوئی رات کی لالی نکلا

رات مجھ سے بھی تو ہر گھر کے دَروبام سجے
چاند کی طرح مرا عکس خیالی نکلا

آہ پھنکار کی مانند دِلوں سے نکلی
کوئی بھی گھر نہ یہاں سانپ سے خالی نکلا

تخت خالی ہی رہا دل کا ہمیشہ ساجد
اس ریاست کا تو کوئی بھی نہ والی نکلا

فنون ص 162۔ شمارہ 2۔ 1 مئی۔ جون 1967ء

○

دہر کے اندھے کنویں میں کس کے آوازہ لگا
کوئی پتھر پھینک کر پانی کا اندازہ لگا

ذہن میں سوچوں کا سورج برف کی صورت نہ رکھ
کُہر کے دیوارودر پر دُھوپ کا غازہ لگا

رات بھی اب جا رہی ہے اپنی منزل کی طرف
کس کی دُھن میں جاگتا ہے گھر کا دروازہ لگا

کانچ کے برتن میں جیسے سرخ کاغذ کا گُلاب
وہ مجھے اِتنا ہی اچھا اور تروتازہ لگا

پیار کرنے بھی نہ پایا تھا کہ رُسوائی ملی
جرُم سے پہلے ہی مجھ کو سنگِ خمیازہ لگا

شہر کی سڑکوں پر اندّھی رات کے پچھلے پہر
میرا ہی سایہ مجھے رنگوں کا شیرازہ لگا

جانے رہتا ہے کہاں اقبال ساجدؔ آج کل
رات دن دیکھا ہے اس کے گھر کا دروازہ لگا

○

خوف دل میں نہ ترے دَر کے گدا نے رکھا
دن کو کشکول بھرا، شب کو سرہانے رکھا

فکرِ معیارِ سخن، باعثِ آزار ہوئی
تنگ رکھا، تو ہمیں اپنی قبا نے رکھا

رات فٹ پاتھ پہ دن بھر کی تھکن کام آئی
اُس کا بستر بھی کیا، سر پہ بھی تانے رکھا

خوف آیا نہیں سانپوں کے گھنے جنگل میں
مجھ کو محفوظ، مری ماں کی دُعا نے رکھا

یہ الگ بات سمندر پہ وہ برسی ساجدؔ
اور کسی کھیت کو پیاسا نہ گھٹا نے رکھا

بسے ہوئے تو ہیں لیکن دلیل کوئی نہیں
کچھ ایسے شہر ہیں جن کی فصیل کوئی نہیں

کروں نہ پیار میں اس سے تو کس سے پیار کروں؟
کہ اس سے بڑھ کے شکیل و جمیل کوئی نہیں

تری شناخت الگ ہے، مری شناخت الگ
مجھے خبر ہے کہ میرا مثیل کوئی نہیں!

کسی سے کس لئے انصاف مانگنے جاؤں
عدالتیں ہیں بہت اور وکیل کوئی نہیں

سبھی کے ہاتھوں پہ ہے درج ان کا نام و نسب
یہ شہر وہ ہے جہاں بے قبیل کوئی نہیں

ابھی سے ڈھونڈ لو راہیں بھی بچ نکلنے کی
یہاں تو پیاسے مرو گے، سبیل کوئی نہیں

سفر کرے تو بھلا کس طرح کرے شبنم
کہ راستوں پہ یہاں سنگِ میل کوئی نہیں

○

ہسپتالوں میں یہ کاروبار بھی کرنا پڑا
مجھ کو اپنے خون کا بیوپار بھی کرنا پڑا

مستحق لوگوں میں بھی بانٹے ہیں ہیرے خون کے
کچھ مریضوں کے لئے ایثار بھی کرنا پڑا

چلتے پھرتے تھیٹروں میں ایک جوکر کی طرح
ہنسنے رونے کا مجھے کردار بھی کرنا پڑا

میں نے لوگو! اپنی سوچوں کی سمگلنگ آپ کی
جُرم جب عائد ہوا، اِنکار بھی کرنا پڑا

اپنی غزلوں کے تراشے، جسم پر چپکا لئے
مُشتہر خود کو سرِ بازار بھی کرنا پڑا!

چائے کی پیالی پہ، ہاں میں ہاں ملانا پڑ گئی
دوستوں میں خود کو بُرخوردار بھی کرنا پڑا

کیا کروں پتھر کو انجکشن لگانا پڑ گئے
وہ کہ بے حس تھا اُسے بیدار بھی کرنا پڑا

اک طرف حالات سے اور اک طرف دشمن کے ساتھ
خود کو لڑنے کے لئے تیار بھی کرنا پڑا

ہائے جس دُشمن نے پہنایا مجھے طوقِ شکست
اس کو سینے سے لگا کر پیار بھی کرنا پڑا

اوراق ص 159 اکتوبر، نومبر 1972ء

○

پھول اپنے پاس ہے، خوشبو بھی اپنے پاس ہے
چاند سورج تو الگ، جگنو بھی اپنے پاس ہے

حرف پھر کیسے مرے نام و نسب پر آئے گا؟
جانتی ہوں جب کہ اپنی خُو بھی اپنے پاس ہے

وہ کہ جس کے خون سے روشن ہے دُنیا آج بھی
اُس کے رونے کے لئے آنسو بھی اپنے پاس ہے

اس لئے ڈرتی ہوں میں، کافر نہ کہلاؤں کہیں
ورنہ کرنے کے لئے جادُو بھی اپنے پاس ہے

پیار انسانوں سے میں کرتی ہوں، اس کے باوجود
دوستو! نفرت کا اک پہلو بھی اپنے پاس ہے

خوفِ دُنیا اِس لئے دل میں نہیں شبنمؔ شکیل
اے خدا ہر ایک لمحہ تُو بھی اپنے پاس ہے

فنون ص 137 شمارہ 5 '4 فروری 'مارچ 1966ء

○

ہر کسی کو کب بھلا یوں مُسترد کرتا ہوں میں؟
تُو ہے خوش قسمت اگر تجھ سے حسد کرتا ہوں میں

بُغض بھی سینے میں رکھتا ہوں، امانت کی طرح
نفرتیں کرنے پہ آ جاؤں تو حد کرتا ہوں میں

کوئی اپنے آپ کو منوانے والا بھی تو ہو
ماننے میں کب کسی کے رَدوکَد کرتا ہوں میں

کچھ شعوری سطح پر، کچھ لاشعوری طور پر
کارِ فکروفن میں اب سب کی مدد کرتا ہوں میں

اس لئے مجھ سے خفا ہیں اہلِ گُلشن آج کل
رنگ جُھٹلاتا ہوں، خُوشبو مُسترد کرتا ہوں میں

میرے جذبوں سے بچاؤ، نیک دل لوگو مجھے
روزوشب اِن بدمعاشوں کی مدد کرتا ہوں میں

دوسروں کے واسطے لکھا ہوا لگتا ہے جُھوٹ
اپنی سچائی کو اکثر آپ رَد کرتا ہوں میں

رنگ پر آئی ہوئی ہے اب جنوں خیزی میری
روزوشب توہینِ اربابِ خرد کرتا ہوں مَیں

طوق گردن میں پہنتا ہوں لہو کی دھار کا
خلق کو حیران ساجد زد بہ زَد کرتا ہوں میں

"نقوش" ص 256 جنوری 1979ء

○

سائے کی طرح بڑھ نہ کبھی قد سے زیادہ
تھک جائے گا، بھاگے گا اگر حد سے زیادہ

ممکن ہے ترے ہاتھ سے مٹ جائیں لکیریں
اُمّید نہ رکھ گوہرِ مقصد سے زیادہ

لگ جائے تجھی پر نہ ترے قتل کا الزام
بدنام تو ہوتا ہے بُرا، بَد سے زیادہ

خواہش ہے بڑائی کی تو، اندر سے بڑا بن
کر ذہن کی بھی نشوونما قد سے زیادہ

دیکھوں تو، مرے جسم پہ شاخیں ہیں نہ پتّے
سوچوں تو، گھنا چھاؤں میں برگد سے زیادہ

رہنے دو، خلاؤں میں مری قبر نہ کھودو
ہے پیار مجھے خاک کی مسند سے زیادہ

آنکھیں تو لگی رہتی ہیں دروازے پہ لیکن
ہوتی ہے خوشی اپنی ہی آمد سے زیادہ

کیا جانئے کیا بات ہے، اک عمر سے ساجد
ویران ہے ٹوٹے ہوئے مرقد سے زیادہ

○

خُشک اس کی ذات کا سارا سمندر ہو گیا
دُھوپ کچھ ایسی پڑی وہ شخص بنجر ہو گیا

آنگن آنگن زہر برسائے گی اس کی چاندنی
وہ اگر مہتاب کی صورت اُجاگر ہو گیا

میرے آدھے جسم کی اس کو لگے گی بَددعا
کل خبر آ جائے گی وہ شخص پتھر ہو گیا

کس نے اپنے ہاتھ سے خود موت کا کتبہ لکھا؟
کون اپنی قبر پر عبرت کا پتھر ہو گیا

قُرب جب حد سے بڑھا دُوری مقدّر ہو گئی
اُس کا ملنا بھی نہ ملنے کے برابر ہو گیا

میں کہ باہر کی فضا میں قید تھا جس کے سبب
آج وہ خود حبس کے پنجرے کے اندر ہو گیا

مُفت میں تقسیم کی ساجد متاعِ شاعری
جس نے اپنا قُرب اپنایا وہ شاعر ہو گیا

○

وہ چاند ہے تو عکس بھی پانی میں آئے گا
کردار خود اُبھر کے کہانی میں آئے گا

چڑھتے ہی دُھوپ شہر کے کھُل جائیں گے کواڑ
جسموں کا ریگزار روانی میں آئے گا

آئینہ ہاتھ میں ہے تو سورج پہ عکس ڈال
کچھ لطف بھی سُراغ رسانی میں آئے گا

دل میں لگے گی آگ تو سُلگے گی آنکھ بھی
یہ شعلہ خود ہی آبِ معانی میں آئے گا

رختِ سفر بھی ہو گا مرے ساتھ شہر میں
صحرا بھی شوقِ نقلِ مکانی میں آئے گا

پھر آئے گا وہ مجھ سے بچھڑنے کے واسطے
بچپن کا دور پھِر سے جوانی میں آئے گا

کب تک لہو کے جبس سے گرمائے گا بدن؟
کب تک اُبال آگ سے پانی میں آئے گا؟

صورت تو بھُول بیٹھا ہوں، آواز یاد ہے
اک عمر اور ذہن گرانی میں آئے گا

ساجد تُو اپنے نام کا کتبہ اُٹھائے پھر
یہ لفظ کب لباسِ معانی میں آئے گا

○

کہا کسی سے نہیں خال خال پہنی ہے
بدن پر کھال مگر لازوال پہنی ہے

ہمارا عرش ہی ٹھہرا تو فرش ہی ٹھہرا
جہاں بھی سو گئے، گدڑی کی شال پہنی ہے

یہی کہ گردِ مسافت بڑا مقدّر تھی
رِدا بھی ہم نے بڑی بے مثال پہنی

یہ اور بات ہے موسم تو خُوبرو نہ ہوا
مگر شمر نے قبا ڈال ڈال پہنی ہے

ہمارا سونا ہی فٹ پاتھ کی بہار ہوا
جو چیز پہنی برنگِ جمال پہنی ہے

○

کئی برسوں سے بچّوں کا نگر اچھا نہیں لگتا
کسی کا کیا، مجھے اپنا بھی گھر اچھا نہیں لگتا

قدم دہلیز سے باہر نہیں جن کے وہ کہتے ہیں
در و دیوار کے اندر سفر اچھا نہیں لگتا

نہ اس پر پھول آتے ہیں، نہ اس پر سنگ آتے ہیں
اب اس کے صحن میں مجھ کو شجر اچھا نہیں لگتا

مرا جذبہ ہو یا ہو تیری خواہش، دل کے موسم میں
پرندہ کوئی بھی بے بال و پر اچھا نہیں لگتا

بنانے والے نے اس کا عجیب پیکر بنایا ہے
بدن لگتا اچھا اور سر اچھا نہیں لگتا

سروں کو ہاتھ پر رکھنا یہاں سب بھول بیٹھے ہیں
مجھے اس واسطے آنکھوں کا ڈر اچھا نہیں لگتا

چمک سے پیار کرنا کس قدر مہنگا پڑا ساجد
اسے مہتاب اور مجھ کو شرر اچھا نہیں لگتا

بشکریہ
احمد ندیم قاسمی

○

ایسے گھر میں رہ رہا ہوں، دیکھ لے بے شک کوئی
جس کے دروازے کی قسمت میں نہیں دستک کوئی

یوں تو ہونے کو سبھی کچھ ہے مرے دل میں مگر
اِس دُکاں پر آج تک آیا نہیں گاہک کوئی

وہ خُدا کی کھوج میں خود آخری حد تک گیا
خود کو پانے کی مگر کوشش نہ کی انتھک کوئی

باغ میں کل رات پھولوں کی حویلی لُٹ گئی
چشمِ شبنم سے چُرا کر لے گیا ٹھنڈک کوئی

دے گیا آنکھوں کو فرشِ راہ بننے کا صلہ
دے گیا بینائی کو سوغات میں دیمک کوئی

ایک بھی خواہش کے ہاتھوں میں نہ مہندی لگ سکی
میرے جذبوں میں نہ دُولہا بن سکا اب تک کوئی

وہ بھی ساجدؔ تھا مرے جذبوں کی چوری میں شریک
اُس کی جانب کیوں نہیں اُٹھی نگاہِ شک کوئی؟

○

وہ دوست تھا تو اُسی کو ہی عدُو بھی ہونا تھا
لہو پہن کے مجھے سرخرُو بھی ہونا تھا

سُنہری ہاتھ میں تازہ لہو کی فصل نہ دی
کہ اپنے حق کے لئے جُنگجُو بھی ہونا تھا

بگُولہ بن کے سمندر میں خاک اُڑانا تھی
کہ لہر لہر مجھے تُندخُو بھی ہونا تھا

مرے ہی حرف دکھاتے تھے میری شکل مجھے
یہ اشتہار مرے رُوبرُو بھی ہونا تھا

کشش تھی پھُول سی اُس میں، تو لامحالہ مجھے
اسیرِ رنگ، گرفتارِ بُو بھی ہونا تھا

سزا تو ملنا تھی مجھ کو برہنہ لفظوں کی
زباں کے ساتھ لبوں کو رفُو بھی ہونا تھا

سفر کا بوجھ اُٹھانے سے پیشتر ساجد
مزاج دانِ رہِ جُستجو بھی ہونا تھا

فنون ص 400 شمارہ 4- 3 جنوری، فروری 1968ء

○

رُخِ روشن کا روشن، ایک پہلو بھی نہیں نکلا
جسے میں چاند سمجھا تھا، وہ جُگنو بھی نہیں نکلا

وہ تیرا دوست جو پھُولوں کو پتھرانے کا عادی تھا
کچھ اُس سے شُعبدہ بازی میں کم تُو بھی نہیں نکلا

ابھی کس منہ سے میں دعویٰ کروں شاداب ہونے کا
ابھی ترَشے ہوئے شانے پہ بازُو بھی نہیں نکلا

گھروں سے کس لئے یہ بھیڑ سڑکوں پر نکل آئی؟
ابھی تو بانٹنے وہ شخص خُوشبو بھی نہیں نکلا

شکاری آئے تھے دل میں شکارِ آرزو کرنے
مگر اس دشت میں تو ایک آہو بھی نہیں نکلا

تری بھی حُسن کاری کے ہزاروں لوگ ہیں قائل
گلی کوچوں سے لیکن اُس کا جادُو بھی نہیں نکلا

بتا اِس دور میں اقبال ساؔجد کون نکلے گا؟
صداقت کا عَلَم لے کر اگر تُو بھی نہیں نکلا

○

دنیا نے زَر کے واسطے، کیا کچھ نہیں کیا؟
اور ہم نے شاعری کے سوا، کچھ نہیں کیا

غُربت بھی اپنے پاس ہے اور بھُوک ننگ بھی
کیسے کہیں کہ اس نے عطا کچھ نہیں کیا؟

چُپ چاپ گھر کے صحن میں فاقے بچھا دیئے
روزی رساں سے ہم نے گلہ کچھ نہیں کیا

پچھلے برس بھی بوئی تھیں لفظوں کی کھیتیاں
اب کے برس بھی اس کے سوا، کچھ نہیں کیا

غربت کی تیز آگ پہ اکثر پکائی بُھوک
خُوشحالیوں کے شہر میں کیا کچھ نہیں کیا؟

دُنیا کو جانتے تھے کہ دل کی غریب تھی
اِس سے طلب سخن کا صلہ کچھ نہیں کیا

بستی میں خاک اُڑائی، نہ صحرا میں ہم گئے
کچھ دن سے ہم نے خَلقِ خدا کچھ نہیں کیا

مانگی نہیں کسی سے بھی ہمدردیوں کی بھیک
ساجد کبھی خلافِ اَنا کچھ نہیں کیا

"شاعری" ص 17 دسمبر 1981ء

○

سُورج ہوں، چمکنے کا بھی حق چاہیے مجھ کو
میں کُہر میں لپٹا ہوں، شَفق چاہیے مجھ کو

ہو جائے کوئی چیز تو مجھ سے بھی عبارت
لکھنے کے لئے سادہ وَرق چاہیے مجھ کو

خنجر ہے تو لہرا کے مرے دل میں اُتر جا
ہے آنکھ کی خواہش کہ شَفق چاہیے مجھ کو

ہو وہم کی دستک کہ کسی پاؤں کی آہٹ
جینے کے لئے کچھ تو رمق چاہیے مجھ کو

ہر بار مری راہ میں حائل ہو نیا سنگ
ہر بار کوئی تازہ سبق چاہیے مجھ کو

جو کچھ بھی ہو باقی، وہ مرے ہاتھ پہ لکھ دے
مضمون بہرِطور اَدق چاہیے مجھ کو!

جو ذہن میں تصویر ہے، کاغذ پر اُتر آئے
دنیا میں نمائش کا بھی حق چاہیے مجھ کو

ہر پھُول کے سینے میں گُلِ سنگ ہو ساؔجد
ہر سنگ، میں اک رنگِ قلق چاہیے مجھ کو

فنون ص 184 شمارہ 2 دسمبر 1966ء

○

چُپکے سے آ کے، دھیان کی زنجیر کھینچ لے
خوابوں کی چھت سے وہم کے شہتیر کھینچ لے

چُپ کس لئے ہے، اینٹ کا پتھر سے دے جواب؟
حق چاہئے تو میان سے شمشیر کھینچ لے

مظلُوم ہے تو پیش ہو، دربارِ وقت میں
انصاف چاہتا ہے تو زنجیر کھینچ لے

گھونٹیں نہ خواہشوں کا گلا کیوں دلوں میں لوگ؟
جب ہاتھ ہی دُعاؤں سے تاثیر کھینچ لے

پھر دوسروں کی آنکھ میں تنکا تلاش کر
پہلے خود اپنی آنکھ سے شہتیر کھینچ لے

تجسیم کر کے شُعلۂ آواز کی لپک
اُن دیکھی جیتی جاگتی تصویر کھینچ لے

ممکن ہے دُھول جھونک کے سُورج کی آنکھ میں
ذرّے کا ہاتھ میان سے شمشیر کھینچ لے

کہتے ہیں وقت لَوٹ کے آتا نہیں کبھی
اِس یادگار لمحے کی تصویر کھینچ لے

ساجدؔ گُلِ مُراد کو دامن میں خود گرا
اپنے ہی ہاتھ پر خطِ تقدیر کھینچ لے

O

فزوں حُسنِ نظر سے حُسن کا معیار ہو جائے
جسے میں اک نظر دیکھوں، وہی شہکار ہو جائے

مزاج اپنا ہے پھُولوں سا' طبیعت اپنی شبنم سی
جو اپنا قرُب اپنائے وہ خُوش اَفکار ہو جائے

خدا وہ دن نہ دِکھلائے، مری بستی کے لوگوں کو
خفا جب سایۂ دیوار سے دیوار ہو جائے

دُعا مانگو کہ پھر رنگِ پریدہ لوٹ کر آئے
چمن کے زرد پھولوں میں، مہک بیدار ہو جائے

بچا ہے کون ساجد آفتابِ حُسن کی زد سے؟
نجانے کب کرن کا تیر دل کے پار ہو جائے

○

وہ جبر کی قُوّت کو کبھی گُم نہیں کرتا
حسّاس ہے اِتنا کہ تبسّم نہیں کرتا

میں خود سے لڑائی میں ہوں مصروف شب و روز
کیا جانیئے کیوں ختم تصادم نہیں کرتا

خواہش بھی کئی روز سے سورج سے خفا ہے
جذبہ بھی طوافِ مہ و انجم نہیں کرتا

پینے کے لئے آج بھی ہے نورِ ضیا دیکھ
اُلٹا میں کسی طَور کبھی خم نہیں کرتا

جب ماں کی دُعا ساتھ ہے، سانپوں کے نگر میں
ساؔجد میں حواس اپنے کبھی گُم نہیں کرتا

○

بہارِ طفلاں بھی اس میں، بہارِ گُلشن بھی
کہ اس کے گھر میں شجر بھی ہیں اور آنگن بھی

چھتوں پہ دُھوپ بھی سینکی ہے خوب لوگوں نے
سُنا ہے اس جگہ برسا ہے کُھل کے ساون بھی

خزاں نے کچھ بھی بگاڑا نہیں پرندوں کا!
کہ اُن کے پر بھی سلامت ہیں اور نشیمن بھی

ہمارا دل تو ہے انسانیت کا گہوارہ !
بسے ہوئے ہیں یہاں شیخ بھی، برہمن بھی

ہزاروں عکس ہماری نظر میں رہتے ہیں
نظر بھی اپنی ہے شفّاف اور درپن بھی

○

فطرت نے جو لکھے ہیں وہ کتبے پڑھا کرو
مہنگی ہیں گر کتابیں، تو چہرے پڑھا کرو

بکھرے ہوئے ہیں سینکڑوں مضمون جابجا
سڑکوں سے چن کے کاغذی ٹکڑے پڑھا کرو

لفظوں میں بھی حروف نظر آئیں گے تمہیں
اوراقِ گُل پہ شبنمی قطرے پڑھا کرو

بیکار کیوں ہو، شہر کی سڑکوں پہ بیٹھ کر
ہاتھوں پہ قسمتوں کے نوشتے پڑھا کرو

تعریف کو ہی لوگ خوشامد کہیں، تو پھر
خود اپنی شان میں ہی قصیدے پڑھا کرو

چُبھتی ہے گر شُعاعوں کی تحریر آنکھ میں
ساجدؔ کتابِ خاک کے ذرّے پڑھا کرو

فنون ص 123 شمارہ 6-5 ستمبر، اکتوبر 1970ء

○

لگا دی کاغذی ملبوس پر مُہرِ ثبات اپنی
بشر کے نام کر دی ہے خدا نے کائنات اپنی

خلاء کے آر بھی میں ہوں، خلاء کے پار بھی میں ہوں
عبُور اک پَل میں ہو جائے حدودِ مُمکنات اپنی

جیوں گا اپنی مرضی سے، مروں گا اپنی مرضی سے
مرے زیرِ تسلّط ہے فنا اپنی، حیات اپنی

میں خود ہی آزماؤں گا' خود اپنا آخری داؤ
خبر ہے مجھ کو ساجد جیت بن جائے گی مات اپنی

○

اک ردائے سبز کی خواہش بہت مہنگی پڑی
وقت پڑنے پر ہمیں بارش بہت مہنگی پڑی

ہاتھ کیا تاپے کہ پوروں سے دُھواں اُٹھنے لگا
سبز رُت میں آگ کی تابش بہت مہنگی پڑی

موم کی سیڑھی پہ چڑھ کے چھُو رہے تھے آفتاب
پُھول سے چہروں کو یہ کوشش بہت مہنگی پڑی

ذکرِ قحطِ رنگ سے پہلے ہی تالے پڑ گئے
ہر لبِ تصویر کو جُنبش بہت مہنگی پڑی

خارِ قسمت کیا نکالے، ہاتھ زخمی ہو گئے
ناخنِ تدبیر کی کاوش بہت مہنگی پڑی

تُند خُو موجوں نے ساجدؔ چاند ساحل کھا لئے
بحرِ شب میں امن کی کوشش بہت مہنگی پڑی

○

اُس شوخ کے نازک دل میں یوں معصوم سے جذبے رہتے ہیں
پھُولوں کی حویلی میں جیسے شبنم کے قطرے رہتے ہیں

جس بستی کا وہ باسی ہے، سنتے ہیں وہاں کے لوگوں کی
آنکھوں میں سورج پلتے ہیں، سینوں میں سویرے رہتے ہیں

کل رُوپ شفق کا بھرتا تھا، اب چال دھنک کی چلتا ہے
اس حُسن کے پیکر کے اکثر انداز بدلتے رہتے ہیں

وہ چہرہ ایسا چہرہ ہے، جو سب کو اچھا لگتا ہے
ہر ایک کسی کے ہونٹوں پر بس اس کے قصّے رہتے ہیں

میں یادِ نبیؐ میں اے ساؔجد جب مشق سخن کی کرتا ہوں
اک نورؐ کی صورت کاغذ پر اشعار اُترتے رہتے ہیں

○

کبھی مصروفِ آزادی بھی یہ ہونے نہیں دیتے
مرے بچّے مجھے فٹ پاتھ پر سونے نہیں دیتے

ہنر جب جانتا ہوں میں دلوں کو کاشت کرنے کا
یہ کیسے لوگ ہیں جو بیج بھی بونے نہیں دیتے

جوانی جاگتی ہے جن میں کچھ ایسے بھی چہرے ہیں
جو دن کو سوتے ہیں وہ رات کو سونے نہیں دیتے

میں آخر اپنی آنکھیں جیب میں رکھ کر کہاں جاؤں؟
پڑوس ہیں کہ بینائی سے خوش ہونے نہیں دیتے

عجب انداز کے کچھ لوگ بستے ہیں خیالوں میں
تجھے ہنسنے نہیں دیتے، مجھے رونے نہیں دیتے

وہی آئینہ پیراہن کہ جن میں گرد اُڑتی ہے
غلاظت اپنے ذہنوں کی مجھے دھونے نہیں دیتے

بکھرنے کی اجازت بھی نہیں ہے مجھ کو سڑکوں پر
اسیرِ عقل ساجدؔ، عقل بھی کھونے نہیں دیتے

بشکریہ

احمد ندیم قاسمی

○

ایسا اُجاڑ پَن کبھی، دیکھا نہ تھا حیات میں
بعدِ فساد ہر طرف، سوگ تھا کائنات میں

فرق ہے اسلئے مرے، اُس کے معاملات میں
رِزق مرے نصیب کا، درج ہے اُس کے ہات میں

سعی جو رائیگاں گئی اسکی مجھے تلاش ہے
گھوم رہا ہوں اِس لئے، خوف کے جنگلات میں

جنگ چھڑی ہوئی ہے یوں، قلب و نظر کے درمیان
کانٹے اُگا رہے ہیں لوگ، فصلِ تعلّقات میں

اور نہیں ہے کوئی شے، صرف وہی ہے لازوال
حُسن کا جو مجسّمہ، نصب ہے شہرِ ذات میں

مجھ کو نہ چُن سکا کوئی، آپ ہی جمع ہو گیا
بِکھرا کبھی کبھار جو، ٹُوٹ کے کائنات میں!

سُرخ و سپید شخص تُو، آج ہوا ہے زرد کیوں؟
پہلی سی وہ کشش نہیں، تیری حسین ذات میں

جون 1987ء گلاب دیوی ہسپتال لاہور

○

تقدیسِ ہُنر! تُو مری تکمیل تو کر جا
آ، آخری آیت کی طرح مجھ پہ اُتر جا

یارب، ہو میرا دینِ غزل اور اُفق گیر
ہر لحظہ بُلند اس کا زمانے میں ہو درجا

یہ دُھوپ ہے وہ، جس نے کبھی شاخ نہ دیکھی
چرچا ہے مری فکرِ سحر خیز کا ہر جا

کیا جانئے کیا بات ہے، ذہنوں کے اُفق پر
بجلی نہیں چمکی، ابھی بادل نہیں گرجا

اس شہر میں بکتے ہیں، پرندوں کے نشیمن
اے طائرِ اُمّید نہ بھُولے سے اُدھر جا

اِس ظُلم کی بستی سے تُو آندھی کی طرح اُٹھ
اِس شہر کی گلیاں خس و خاشاک سے بھر جا

پھینکے تھے گہر جنکی طرف، اُن کے سروں سے
اب موجِ بلاخیز کی مانند گزُر جا

ہے رقص کی خواہش، تو بگُولے کی طرح ناچ
صحرا ہے اگر تنگ، خلاؤں میں بِکھر جا

حسرت سے نہ ہاتھوں کی لکیروں کی طرف دیکھ
جا وقت کے ماتھے پہ شکن بن کے اُبھر جا

ساؔجد کو لقب دے نہ مسیحائے غزل کا
اے خلق! مرے معجزۂ فن سے مُکر جا

"اپنی زمین" ص 3 1 اپریل 1977ء

○

سُرخ لہو سے یہ پھُلواڑی کرتا ہوں
میں لفظوں کی کھیتی باڑی کرتا ہوں

شعر و سُخن کی دُنیا میں اِک مدت سے
نئے نئے تیار کھلاڑی کرتا ہوں

آڑے وقت میں سایہ ہی کام آتا ہے
خود کو پیچھے، اُس کو اگاڑی کرتا ہوں

تُو بھی اب اندر سے خارِ بُغض نکال
صاف میں دل سے شک کی جھاڑی کرتا ہوں

تُو بھی اپنے جسم کے اندر ایندھن ڈال
میں بھی تیز لہو کی گاڑی کرتا ہوں

دُھت رہتا ہوں اپنے خون کے نشّے میں
رقص خوشی سے پی کر تاڑی کرتا ہوں

ویسے تو انسان ہوں سیدھا سادہ مَیں
باتیں لیکن ترچھی آڑی کرتا ہوں

○

اِس سال شرافت کا لبادہ نہیں پہنا
پہنا ہے مگر اِتنا زیادہ نہیں پہنا

اس نے بھی کئی روز سے خواہش نہیں اوڑھی
میں نے بھی کئی دن سے ارادہ نہیں پہنا

دوڑے ہیں، مگر صحن سے باہر نہیں دوڑے
گھر ہی میں رہے، پاؤں میں جادہ نہیں پہنا

آباد ہوئے جب سے یہاں تنگ نظر لوگ
اِس شہر نے ماحول کُشادہ نہیں پہنا

درویش نظر آتا تھا ہر حال میں لیکن
ساجدؔ نے لباس اِتنا بھی سادہ نہیں پہنا

○

مکاں گروی، در و دیوار گروی
ہماری خواہشیں، معیار گروی

ہمارے سر رکھے ہیں رہن اس نے
ہمارے نام کی دستار گروی

سمگلنگ کی گئی اپنے جنوں کی
خرد رکھی گئی اُس پار گروی

چمن سارے کا سارا لُٹ گیا ہے
ہَوا، خُوشبو، گُلُ و اشجار گروی

مجھے ڈر ہے کہ اب اقبال ساجد
وہ رکھے گا مرا پندار گروی

○

قصور اس کا نہیں تھا، یہ کیا نکال دیا
خود اپنے قلب سے اس نے خدا نکال دیا

تم اپنی ذات کے اندر بڑے سہی' لیکن
مجھے یہ دُکھ نہیں انساں بڑا نکال دیا؟

رُتوں میں آئی فقط ایک ہی مہک لے کر
تجھے تو یونہی چمن سے صبا نکال دیا

مری زمیں پہ برسنے کی کیا ضرورت تھی؟
جب آسمان نے تجھ کو گھٹا، نکال دیا

برہنگی بھی بڑی بات ہے بدن کے لئے
نکالنا نہ تھا تجھ کو قبا نکال دیا

اکائی دل میں ہے جب تک کہ دل سلامت ہے
میں کیسے مان لوں جو حوصلہ نکال دیا؟

کوئی تلاش کرے یا کرے نہ اے ساجد
کہ ہم نے جیب سے گھر کا پتہ نکال دیا

○

اپنی اَنا کی آج بھی تسکین ہم نے کی
جی بھر کے اُس کے حُسن کی توہین ہم نے کی

لہجے کی تیز دھار سے زخمی کیا اسے
پیوست دل میں لفظ کی سنگین ہم نے کی

لائے بروئے کار نہ حُسنِ جمال کو
موقع تھا پھر بھی رات نہ رنگین ہم نے کی

جی بھر کے دل کی موت پہ رونے دیا اسے
پُرسہ دیا نہ صبر کی تلقین ہم نے کی

دریا کی سیر کرنے، اکیلے چلے گئے
شامِ شَفق کی آپ ہی تحسین ہم نے کی

اردو زبان ص 35 شمارہ 5 - 4 اپریل، مئی 1982ء

○

دُور کی ساری تھکن خود میرے ہی معیار نے
دُھوپ جب حد سے بڑھی سایہ دیا دیوار نے

جیب میں کچھ بھی نہیں تھا، پھر پگھلتی کس طرح
سردمہری مجھ سے برتی گرمئی بازار نے

میری گردِ رہگزر سے دوستی تھی اس لئے
راہ میں آنکھیں بچھائیں سایۂ اشجار نے

حادثہ ایسا تھا سڑکوں پر نکل کر آ گئے
آگ ہر گھر میں لگا دی سرخیٔ اخبار نے

گھر سے میری معنوی اولاد اُٹھا کر لے گیا
یعنی اپنا اصل ظاہر کر دیا خرکار نے

شکل اس کی تھی مگر تختی تھی میرے نام کی
چور ثابت کر دیا اس کو میرے اشعار نے

اک طرف خوشیاں پڑی تھیں، اک طرف رکھّے تھے کرب
کِھل کے یہ منظر دکھائے شہر کے بازار نے

خون دل اپنی دوات اور ذہن ہے ساجد بیاض
بھُولنے کا نقص سیکھا ہی نہیں فنکار نے

○

منگوا کے اس سے بھیک، تُو ہر روز عید کر
محتاج گھر سے کوئی ' اپاہج خرید کر

اس موسمِ فریب میں، پوچھے گا تجھ کو کون؟
ایماں کا خوں بہا کہ' صداقت شہید کر

سورج کی بستیوں میں بکیں برف کے گُلاب
گاہک بھی مطمئن ہیں، یہ سودا خرید کر

چہرے شَفق شَفق ہیں، بدن ہیں کرن کرن
منظر پُکارتے ہیں کہ تکمیلِ دید کر

خُوشبو ہوا کے ہاتھ سے تجسیم ہو گئی
تصویر گھر میں رُت سے لگا لے خرید کر

پھُولوں کو بخش دے کہیں طبعِ شگُفتگی
موسم سے حُسن کا نہ تقاضا مزید کر

پیاسے ہیں پھُول پیڑ، اِنہیں روشنی پلا
ظلمت کی بھٹّیوں سے شعاعیں کشید کر

آئینہ رکھ کے سامنے، تنہائی میں کبھی
کچھ اپنی زندگی پہ بھی گُفت و شُنید کر

سوچوں میَں چاند چاند، تو لکھوں دَھنک دَھنک
روشن ہوئے ہیں لوگ مرا فن خرید کر

○

کل شب، دلِ آوارہ کو سینے سے نکالا
یہ آخری کافر بھی مدینے سے نکالا

یہ فوج نکلتی تھی کہاں، خانۂ دل سے
یادوں کو نہایت ہی قرینے سے نکالا

میں خون بہا کر بھی ہوا باغ میں رُسوا
اُس گُل نے مگر کام پسینے سے نکالا

ٹھہرے ہیں زر و سیم کے حق دار تماشائی
اور مارِ سیہ ہم نے دفینے سے نکالا

یہ سوچ کے ساحل پہ سفر ختم نہ ہو جائے
باہر نہ کبھی پاؤں سفینے سے نکالا

ادبِ لطیف ص 88 شمارہ 8-7، 1984ء

○

۱

دُکھوں کے ساتھ بڑھا حوصلہ تباہی میں!
کہ بو رہا ہوں نئی روشنی سیاہی میں

میں آدھے جسم سے زندہ ہوں، یہ بھی کیا کم ہے؟
الٰہی، اور اضافہ نہ کر تباہی میں!

لباسِ آب ملا میرے جسمِ خاکی کو!
ہوا کے عہد میں اور سورجوں کی شاہی میں

نکل رہے ہیں پرندے ہوا کے پنجرے سے
رچھڑی ہوئی ہے یہاں جنگ آب و ماہی میں

وہ جنکی سطح پہ لکھّے تھے چاند چاند حروف
ہوئے شریک وہ دریا مری تباہی میں
کسی کا جسم یہاں بارشوں سے رچھد جائے
کسی کا سایہ جلے دُھوپ کی کڑاہی میں

زمیں پہ ابرِ کرم اے مرے خُدا، مت بھیج
بس اپنی رحمتیں رہنے دے اب خلا ہی میں

"اسلامی جمہوریہ "اوراق" شمارہ 19 اکتوبر 1977ء

○

سایۂ ذات کی تعمیر اُجالے سے ہوئی
مری پہچان، مرے فن کے حوالے سے ہوئی

اشک پی پی کے میں سرسبز ہُوا شام و سحر
جسم کی نشوونما، خشک نوالے سے ہوئی

میں کبھی دُھوپ، کبھی چھاؤں پہن کر نکلا
روز تبدیل فضا میرے حوالے سے ہوئی

چاندنی راتوں کے دامن میں نہیں کوئی چکور
ایک خلقت کہ خفا چاند کے ہالے سے ہوئی

سینکڑوں قیمتی پرچوں میں چھپا میرا کلام
ہوئی پےمنٹ تو اک آدھ رسالے سے ہوئی

دشتِ پُرخار! تجھے پھول دیئے گام بہ گام
تری تزئین، مرے پاؤں کے چھالے سے ہوئی

خواہشیں قید ہوئیں اپنی بُنت میں ساجد
کوئی مکڑی نہ رہا کرب کے جالے سے ہوئی

"پیپنگ ٹام" ص140

○

سورج ہوں، زندگی کی رَمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈُوب بھی گیا تو شَفق چھوڑ جاؤں گا

تاریخِ کربلائے سخن ! دیکھنا کہ میں
خونِ جگر سے لکھ کے وَرق چھوڑ جاؤں گا

اک روشنی کی موت مروں گا زمین پر
جینے کا اس جہان میں حق چھوڑ جاؤں گا

روئیں گے میری یاد میں مہر و مہ و نجوم
اِن آئنوں میں عکسِ قلق چھوڑ جاؤں گا

وہ اوس کے درخت لگاؤں گا جابجا
ہر بُوند میں لہو کی رَمق چھوڑ جاؤں گا

گزروں گا شہرِ سنگ سے جب آئنہ لئے
چہرے کھُلے دریچوں میں فق چھوڑ جاؤں گا

پہنچوں گا صحنِ باغ میں شبنم رُتوں کے ساتھ
سُوکھے ہوئے گُلوں میں عرق چھوڑ جاؤں گا

ہر سُو لگیں گے مجھ سے صداقت کے اشتہار
ہر سُو محبّتوں کے سبق چھوڑ جاؤں گا

ساجدؔ گُلاب چال چلوں گا روش روش
دھرتی پہ گلستانِ شَفق چھوڑ جاؤں گا

"شام بہار" ص2

○

وہ مسلسل چُپ ہے، تیرے سامنے تنہائی میں
سوچتا کیا ہے؟ اُتر جا بات کی گہرائی میں

سُرخرو ہونے نہ پایا تھا کہ پیلا پڑ گیا
چاند کا بھی ہاتھ تھا جذبات کی پسپائی میں

بے لباسی ہی نہ بن جائے کہیں تیرا لباس
آئینے کے سامنے پاگل نہ ہو تنہائی میں

تُو اگر پھل ہے، تو خود ہی ٹُوٹ کر دامن میں آ
میں نہ پھینکوں گا کوئی پتھر تری انگنائی میں

رات بھر وہ اپنے بستر پر پڑا روتا رہا
دُور اک آواز بنجر ہو گئی شہنائی میں

دائرے بڑھتے گئے، پرُکار کا مُنہ کُھل گیا
وہ بھی داخل ہو گیا اب سرحدِ رسوائی میں

حَبس تو دل میں تھا لیکن آنکھ تَپ کر رہ گئی
رات سارا شہر ڈُوبا درد کی پُروائی میں

آنکھ تک بھی اب جھپکنے کی مجھے فُرصت نہیں
نقش ہے دیوار پر، تصویر ہے بینائی میں

لوگ واپس ہو گئے ساؔجد نمائش گاہ سے
اور میں کھویا رہا اک محشرِ رعنائی میں

اوراق ص 145 شمارہ 3 1967ء

○

سُلگے گا دلِ زار، جلن اور بڑھے گی
محسوس یہ ہوتا ہے، گھُٹن اور بڑھے گی

آسان نہیں منزلِ مقصود کا پانا
اے دوست! ابھی کیا ہے تھکن اور بڑھے گی

سوچوں کی تمازت سے جھُلس جائے گا ہر شخص
احساس کے صحرا کی جلن اور بڑھے گی

بیکار ہے اب چاندنی راتوں کا تصوّر
مہتاب کی کرنوں سے چبھن اور بڑھے گی

آئیں گی اسے راس نہ باہر کی فضائیں
جب سانس وہ لے گا تو گھٹن اور بڑھے گی

اس دور کا ہر شخص، سخن فہم ہے ساجد
فرمائشِ اربابِ سخن اور بڑھے گی

"اسلامی جمہوریہ" شمارہ 19 اکتوبر 1977ء

○

خواہش و اُمّید کی چلنے لگی آندھی بہت
تنگ روزانہ مجھے کرتی ہیں یہ ماں دِھی بہت

آج بھی دریا سے خالی ہاتھ آئے غوطہ زن
اس نے اپنی لاش کی اُمّید تو باندھی بہت

تھے پرِ پرواز لیکن حوصلہ اس میں نہ تھا
باندھنے والوں نے تو اس کی ہوا باندھی بہت

حسرتِ معصوم سے یہ مادرِ دل نے کہا
گھر سے باہر مت نکلنا تیز ہے آندھی بہت

دل کی ساری سُرخپوشی ہے، پسِ دیوارِ پار
اس لئے بے چین ہے یہ سرحدی گاندھی بہت

3؍اکتوبر 1986ء

○

کُھلتے ہیں جُستجو کے یہ دَر، کس کے واسطے؟
نکلی حصارِ شب سے سحر، کس کے واسطے؟

خوابیدہ بستیوں میں نہ جائے شعاعِ مہر
کس کس کا کھٹکھٹائے گی دَر، کس کے واسطے؟

چُنتے ہیں گُلستانِ اُفق سے، گُلِ شفق
مہتاب خُو، ستارہ نظر، کس کے واسطے؟

یہ کون پانیوں کے سفر پہ نکل پڑا؟
پڑتے ہیں موج موج بھنور، کس کے واسطے؟

لکھوں میں جاگنے کا عمل کیوں وَرق وَرق
ترتیب دوں کتابِ ہُنر، کس کے واسطے؟

پھر جمع کر رہے ہیں بُرائی کے شہر میں
لوگ اپنی نیکیوں کے ثمر، کس کے واسطے؟

ہے جاہلوں کے سامنے تخلیق کا زیاں
رکھوں نمائشوں میں ہُنر، کس کے واسطے؟

اچھا نہیں ہے، دل میں عمل ٹُوٹ پھُوٹ کا
جذبوں کو کر رہا ہوں کھنڈر، کس کے واسطے؟

"نقوش" جنوری 1976ء

○

بے خبر دنیا کو رہنے دو، خبر کرتے ہو کیوں ؟
دوستو! میرے دُکھوں کو مُشتہر کرتے ہو کیوں ؟

کوئی دروازہ نہ کھولے گا، صدائے درد پر
بستیوں میں شوروغُل شام وسحر کرتے ہو کیوں ؟

مجھ سے غُربت مول لیکر، کون گھر لے جائیگا؟
تم مجھے رُسوا سرِ بازارِ زر کرتے ہو کیوں ؟

آنکھ کے اندھوں کو کیوں دِکھلاتے ہو، پروازِ حرف؟
کاغذوں پہ اب تماشائے ہُنر کرتے ہو کیوں ؟

تذکرہ لکھتے ہو کیا، میری شکست و ریخت کا
لفظ کی بستی میں معنی کو کھنڈر کرتے ہو کیوں ؟

دوستو! بینائی بخشے گی تمھیں اُن کی اُڑان
پنچھیوں کو چھوڑ دو، بے بال و پر کرتے ہو کیوں ؟

لفظ اگر بوتے تو پھر، فصلِ معانی کاٹتے
دوستو! اب شکوہ اہلِ ہُنر کرتے ہو کیوں ؟

ظالموں کے ساتھ مل جاؤ، رہو گے عیش میں
عمر ساجد کسمپرسی میں بسر کرتے ہو کیوں ؟

اوراق ص 207 نومبر، دسمبر 1984ء

○

خُدا نے جسکو چاہا، اُس نے بچّے کی طرح ضد کی
خُدا بخشش کرے گا اِس لئے اقبال ساجدؔ کی

گواہی دے گا اک دن خود مرا منصف، مرے حق میں
دھری رہ جائیں گی ساری دلیلیں مرے حاسد کی

وہی جو پہلے آیا تھا' وہ سب کے بعد بھی آیا
اُسی پیکر نے تو پہچان کروائی ہے مُوجد کی

جو میرے دل میں تھی اُس نے وہی تحریر پہنچائی
اب اِس سے بڑھ کے کیا تعریف ہو سکتی ہے قاصد کی؟

جو اندر سے نہیں باہر سے خدّوخال منوائے
پہ اصلِ آئینہ صورت گنوا دیتا ہے قاصد کی

حوالے سے جو منوائے، وہ سچّائی نہیں ہوتی
قسم کھاتا نہیں ہوں اسلئے میں ربِّ واحد کی

○

سستی محبّتوں کی ، مہنگائی کاٹتے ہیں
اکثر دِلوں کے تاجر، رُسوائی کاٹتے ہیں

کھیتوں میں جیسے اُنکی ، آنکھیں ٹنگی ہوئی ہیں
اَندھے درانتیوں سے، بینائی کاٹتے ہیں

بے گھر ہوں ہم بلا سے، لیکن حصولِ زر میں
دیوار توڑتے ہیں ، اَنگنائی کاٹتے ہیں

جب حبس میں گھرے تھے، اسوقت تُو کہاں تھی؟
اب ہم ترے چلمن کو، پُروائی کاٹتے ہیں

ساحل کے رہنے والے، جا کر سمندروں میں
گہرائی کی تہوں سے، گہرائی کاٹتے ہیں

اب رفتگاں کی محنت، ہے تجزیہ ہمارا
وہ کوہ کاٹتے تھے' ہم کائی کاٹتے ہیں

اِس حادثے سے بڑھ کر' کیا حادثہ ہو ساجد؟
اپنے ہی گھر میں قیدِ تنہائی کاٹتے ہیں

○

کٹتے ہی سنگِ لفظ، گرانی نکل پڑے
شیشہ اُٹھا کہ جُوئے معانی نکل پڑے

پیاسو! رہو نہ دشت میں بارش کے مُنتظر
مارو زمیں پہ پاؤں کہ پانی نکل پڑے

مجھ کو ہے موج موج گرہ باندھنے کا شوق
پھر شہر کی طرف نہ روانی نکل پڑے

ہوتے ہی شام جلنے لگا یاد کا اَلاؤ
آنسو سُنانے دُکھ کی کہانی نکل پڑے

ساجدؔ تُو پھر سے خانۂ دل میں تلاش کر
ممکن ہے کوئی یاد پُرانی نکل پڑے

"ماہِ نو" ص 37 جولائی 1978ء

○

جس کا سفر نہ ختم ہو وہ رہگذر بھی دے
یاربّ طلب کے پیشِ نظر تو شجر بھی دے

اک حدِ روشنی ہے مرا مقصدِ حیات
تاریک راستوں کے لئے ہم سفر بھی دے

کیوں ٹُوٹ پھُوٹتی ہے اکائی مری بتا؟
تیری خبر تو ہے تجھے، میری خبر بھی دے

اس شہر کے مکین تو پتھر کے لوگ ہیں
اس شہر کے نصیب کو آئینہ گر بھی دے

ہاتھوں پہ پھر رہے ہیں جو عزّت لئے ہوئے
ایسے حسین چہروں کو دستِ ہُنر بھی دیکھ

○

خزاں سے ہار کے بازی ، جواریوں کی طرح
شجر کھڑے ہیں چمن میں بھکاریوں کی طرح

تمام شہر میں سایوں کی فصل کاٹ گئیں
چلی شُعاعیں درختوں پہ آریوں کی طرح

گِھرا ہوا ہوں میں جذبات کی سیاست میں
دِکھا رہے ہیں یہ کرتب مداریوں کی طرح

شجر شجر پہ ہے، سورج کا مورچہ قائم
چھپے ہیں دُھوپ کے پنچھی شکاریوں کی طرح

ہجومِ فکر کو درپیش ہے، مسافتِ فن
بھرے ہیں ذہن کے گوشے سواریوں کی طرح

زرِ سُخن جو کیا صرف، بے دریغ کیا
پڑی نہ ہم سے کفایت شعاریوں کی طرح

اوراق ص 226 شمارہ 2۔ 1 جنوری ٗفروری 1976ء

○

پھینک یوں پتھر کہ سطحِ آب بھی بوجھل نہ ہو
نقش بھی بن جائے اور دریا میں بھی ہلچل نہ ہو

کھول یوں مٹھی کہ اک جگنو نہ نکلے ہاتھ سے
آنکھ کو ایسے جھپک، لمحہ کوئی اوجھل نہ ہو

ہے سفر درپیش، تو پرچھائیں کی اُنگلی پکڑ
راہ میں تنہائی کے احساس سے پاگل نہ ہو

پہلی سیڑھی پر قدم رکھ ' آخری سیڑھی پہ آنکھ
منزلوں کی جستجو میں رائیگاں اک پل نہ ہو

ذہن خالی ہو گئے ہیں وقت کے احساس سے
سامنے وہ مسئلہ رکھ، جسکا کوئی حل نہ ہو

جستجو اُس پیڑ کی کیوں ہو کہ جو سایہ نہ دے؟
ہاتھ اس ڈالی پہ کیا پہنچے کہ جس پر پھل نہ ہو؟

سب کے ہی سینوں میں ہے پھیلا ہوا سانسوں کا حبس
کوئی شہر ایسا نہیں، جس کی فضا بوجھل نہ ہو

روز و شب لگتا رہے سوچوں کا میلہ ذہن میں
شور سے خالی کبھی احساس کا جنگل نہ ہو

لوگ اکثر اپنے چہروں پر چڑھا لیتے ہیں خول
تو جسے سونا سمجھتا ہے، کہیں پیتل نہ ہو؟

گرم کر ساجد لہو کو، دھیمی دھیمی آنچ سے
وقت سے پہلے ترے جذبات میں ہلچل نہ ہو

فنون ص 140 شمارہ 2۔ 1 نومبر' دسمبر 1967ء

طفیل صاحب کے لئے

بڑا ہی شور تھا جس دن وفات اُسکی ہوئی
ادب کے باب میں اک کائنات اُسکی ہوئی

چمن میں جب بھی وہ پہنچا تو نرم لہجے میں
پرندوں اور شجر سے بھی بات اُس کی ہوئی

گیا جو دشت میں اپنے "نقوش" چھوڑ گیا
اسی حوالے سے گویا حیات اُس کی ہوئی

شکست کھا کے بھی وہ تو شکست کھا نہ سکا
یہ تم سے کس نے کہا ہے کہ مات اُسکی ہوئی

وہ ایک شخص کہ جو فتح کا سمندر تھا
اِسی لئے تو اکائی بھی ذات اُسکی ہوئی

ملا جو ورثہ میں، جاوید کی امانت ہے
"نقوش" اس کا ہوا، کائنات اُسکی ہوئی

خیال و خواب ضروری ہیں ہر بشر کے لئے
کہ جو تھا زندۂ جاوید بات اُسکی ہوئی

○

کچھ کہنا بھی ایک گنہ اور چُپ رہنا بھی ایک گناہ
اپنے آپ سمندر ہو کر خود بہنا بھی ایک گناہ

طاقت اور کمزوری میں فرق یہی تو ہوتا ہے
ظلم بھی کرنا ایک ثواب اور سہنا بھی ایک گناہ

لاکھ اُجالے بانٹے کوئی اپنے آپ اکائی میں
چاند کی صورت زندہ رہنا اور گہنا بھی ایک گناہ

خوش بختی سے ہاتھ آئے تو وہ بھی سب پر کُھلتا ہے
اک لمحے کے اندر اپنا خوش رہنا بھی ایک گناہ

سونا پاس نہیں ہے جن کے وہ مجرم کہلاتے ہیں
کانسی سے جو بنا ہوا ہے وہ گہنا بھی ایک گناہ

○

سفر اور خواب میں روشن اشاروں کی طرف جانا
کہ سُوئے مہر رخ کرنا، ستاروں کی طرف جانا

کبھی یہ اپنا شیوہ تھا مگر اب اُنکی عادت ہے
بھنّور کو ناؤ میں لے کر، کناروں کی طرف جانا

پڑھا تھا جو کتابوں میں، وہ منظر آنکھ سے دیکھا
کہ اک خلقت کا دن ڈھلتے ہی غاروں کی طرف جانا

بہاریں ہر طرف تقسیم کرنا اپنی اُلفت کی!
نقوشِ حُسن لے کر خارزاروں کی طرف جانا

مفادِ اہلِ منّت ہے کہ یہ دخلِ عقیدت ہے
سُنہری چادریں لے کر، مزاروں کی طرف جانا

○

تم نے سونے کی ڈلی کیا مجھے لا کر دی ہے؟
میں نے بچّوں کو اگر بھوک کما کر دی ہے

مرے الفاظ ہی کر دیتے ہیں نیکی ظاہر
شعر کی بھیک جنہیں میں نے چھپا کر دی ہے

میں ہوں خوش بخت سبھی رنگ ملے ہیں مجھ کو
تتلیوں نے مجھے تصویر بنا کر دی ہے

طوقِ لعنت مجھے لگتی ہے گلے میں تیرے
اُس نے سونے کی جو زنجیر بنا کر دی ہے
وہ ہے دیوالیہ کب جانے خیانت ہو جائے
اُس نے یوں تیری امانت تجھے لا کر دی ہے

ایک سے ایک گُنہگار ہے ہم میں ساجد
اُس خداوند نے یوں اپنی دُعا کر دی ہے

○

وہ ہم پہ ٹوٹ کے حملہ شدید کر دے گا
غنیمِ جنگ میں ہم کو شہید کر دے گا

وہ لے چلا ہے ہمیں جو دکانِ ہستی میں
ہمیں یقین ہے نفرت خرید کر دے گا

مجھے یقین ہے ساجد کہ میرا ربِّ عظیم
مجھے حریمِ غزل میں فرید کر دے گا

قطعہ

اے دوست میرے حالِ زبوں پر نہ طنز کر
کچھ حوصلے بھی ہیں مری بیچارگی کے ساتھ

ہر انقلابِ زیست پہ تو نے دیئے فریب
ہر موڑ پہ لُٹا میں بڑی سادگی کے ساتھ

○

عدوئے دل کی کبھی پوری اُمنگ ہو جائے
مزہ تو جب ہے اسی وقت جنگ ہو جائے

شناخت وہ نہیں جس کے نہیں ہیں خدوخال
وہ شخص کیا ہے؟ جو بےنام و ننگ ہو جائے

بس ایک سوچ ہے جس سے میں روز ڈرتا ہوں
یہ زندگی کہیں تم پر نہ تنگ ہو جائے

بہت ہی پیار ہے اُس سے مجھے خداوندا
کہیں وہ پھُول سا چہرہ نہ سنگ ہو جائے

خُدائے نُور! مقدّر جگا دے اب اِس کا!
مرے بھی دل کی منوّر ترنگ ہو جائے

ہوا کے رُخ پہ اُڑائی اُمید یوں ساجدؔ
کہ سرخُرو کسی صورت پتنگ ہو جائے

○

فکر کیوں ہو، گھٹن ہے اپنے پاس
جب ہوا کا چلن ہے اپنے پاس

کیوں کسی اور کے سپرد کریں؟
اپنے دل کی جلن ہے اپنے پاس

ہم خدائے سخن نہیں لیکن!
کائناتِ سخن ہے اپنے پاس

مُفلسی نعمتِ خداوندی
ہڈیوں کا بدن ہے اپنے پاس

سب کی تعریف منہ پہ کرتے ہیں
جذبۂ مکر و فن ہے اپنے پاس

اس امانت کے خود امیں ہم ہیں
اپنے دل کی جلن ہے اپنے پاس

مسئلہ طے نہیں ہوا دل کا
یہ چمن ہے کہ بَن ہے اپنے پاس

صبح کے پاس جو نہیں ساؔجد
وہ اُچھوتی کرن ہے اپنے پاس

○

دُہائی دوں، کہ کھُلے ظُلم سے بچائے مجھے
کوئی نہیں مرے پنجے سے جو چھُڑائے مجھے

مرے ہی مُنہ کو مرا خون لگ چکا ہے، یہاں
مرے سوا کوئی قاتل نظر نہ آئے مجھے

کوئی گلُاب بھی مارے، تو مُشتعل ہو جاؤں
کہ رنگ و نُور کی بارش بھی اب جلائے مجھے

میں اپنے جسم کی بوری کو ٹھوکریں ماروں
مگر یہ شغلِ اذیّت پسند آئے مجھے

نکالے سنگ سے پیکر' بغیر نقب لگائے
کوئی چُرائے، تو پھر اس طرح چُرائے مجھے

میں اشتہار لگاؤں بدن پہ غزلوں کے
وہ چاہتا ہے کہ شوکیس میں سجائے مجھے

میں خود بھی اپنے اشاروں پہ آج تک نہ چلا
وہ اُنگلیوں پہ بھلا کس طرح نچائے مجھے؟

کٹاؤں سر کو' نہ بیچوں قلم کی حُرمت کو
عزیز جاں سے زیادہ ہے اپنی رائے مجھے

بدل چکے ہیں رویّے، شکایتیں کیسی؟
میں جس سے بچ کے چلوں، وہ نہ مُنہ لگائے مجھے

مزہ تو جب ہے، شُعاعیں بھی چھتریاں بن جائیں
خود آفتاب چلے لے کے سائے سائے مجھے

قیام کرتی ہے ساجدؔ نئی نئی خواہش
اُجاڑ لگتی ہے دل کی مگر سرائے مجھے

فنون جنوری' فروری 1973ء

○

اک طبیعت تھی، سو وہ بھی لااُبالی ہو گئی
ہائے یہ تصویر بھی رنگوں سے خالی ہو گئی

آنکھ جب برسی تو سارا جسم تازہ ہو گیا
پہلی بارش سے ہی غائب خُشک سالی ہو گئی

باغ کا سب سے بڑا جو پیڑ تھا، وہ جُھک گیا
پُھل لگے اِتنے کہ بوجھل ڈالی ڈالی ہو گئی

جو مرے چہرے پہ لکھا تھا، وہ سب نے پڑھ لیا
حرف قاسہ بن گئے، صورت سوالی ہو گئی

پڑھتے پڑھتے تھک گئے سب لوگ، تحریریں مری
لکھتے لکھتے شہر کی دیوار کالی ہو گئی!

کُھل گئی مُٹھی، تو میرا ہاتھ خالی رہ گیا
مجھ میں جو روشن تھا، اُسکی شکل کالی ہو گئی

اب تو دروازے سے اپنے نام کی تختی اُتار
لفظ ننگے ہو گئے، شُہرت بھی گالی ہو گئی

اِتنی تصویریں جلیں، سینے کے آتش دان میں
گھر کے روشندان کی لکڑی بھی کالی ہو گئی

صبح کو دیکھا، تو ساجد دل کے اندر کچھ نہ تھا
یاد کی بستی بھی راتوں رات خالی ہو گئی

○

جو خوف سے سہما ہوا اب کانپ رہا ہے
کہتے ہیں کسی دَور میں خود سانپ رہا ہے

سردی میں بھی شدّت پہ ہے جذبے کی حرارت
وہ برف کی چادر سے اسے ڈھانپ رہا ہے

سانسوں کی مسافت سے بدن چُور ہے اس کا
جو موت کے پہلو میں کھڑا ہانپ رہا ہے

غیرت کا کچھ احساس تو باقی ہے ابھی تک
اے دستِ طلب! خوش ہوں کہ تُو کانپ رہا ہے

میں جس کے ارادوں کا بدن سُونگھ رہا تھا
حیرت ہے کہ وہ شخص مجھے بھانپ رہا ہے

ساجد مجھے مشکل میں بچایا ہے عصا نے
ہر وقت مرے ہاتھ میں یہ سانپ رہا ہے

○

دُنیا ہے، جانتا ہوں میں تیرے مزاج کو
رکھ اپنے سر پہ آپ ہی، شُہرت کے تاج کو

فائز کریں گے لوگ مجھے منصبوں پہ کیا؟
میں نے تو خود مقام دیا ہے سماج کو

قطروں کی طرح لوگ سمندر میں جا گرے
رنگوں نے خود قبول کیا امتزاج کو

اظہار کر زباں سے کسی لفظ کے بغیر
چُپ رہ، صدا کا رنگ نہ دے احتجاج کو

وُسعت نظر ہے، آنکھ میں رنگِ حسد نہ گھول
عینک ہٹا کے دیکھ، نئے اندراج کو

ساجدؔ بچا لے جسم کے اندر لہو کی فصل
رکھ لے بُرے دنوں کے لئے بھی اناج کو

ادبی دنیا ص 69 شمارہ 28 جنوری، فروری 1970ء

○

کیا آن کا ہے ذکر، انا بھی شہید کی
نام آوری کے شوق نے مٹی پلید کی

مجھ کو ادب کے دار پہ کھینچو کہ مَیں نے کیوں
شہزادیٔ سخن سے محبّت شُنید کی

کل رات میرے ساتھ ستارے بھی رو پڑے
دیکھی گئی نہ ان سے تباہی اُمید کی

اُجڑے ہوئے مکان کے نقش و نگار دیکھ
سینے میں میرے جھانک جو خواہش ہے دِید کی

اُس میں بھی اب نہیں رہا بِکنے کا حوصلہ
مجھ میں بھی ختم ہو گئی قُوّت خرید کی

جذبوں نے آنکھ کھول کے پہلی کرن کے ساتھ
ہر صبح جمع کی ہے اِکائی اُمید کی

ساجد میں اسکے حُسن کی توصیف کیا کروں ؟
کافی ہے جیتی جاگتی خواجہ فریدؒ کی

○

جانے کیوں گھر میں مرے دشت و بیاباں چھوڑ کر
بیٹھتی ہیں بے سروسامانیاں سر جوڑ کر

کتنی نظریں، کتنی آسیں، کتنی آوازیں یہاں
لوٹ جاتی ہیں در و دیوار سے سر پھوڑ کر

جانے کس کی کھوج میں پیہم بگولے آجکل
پھر رہے ہیں شہر کی گلیوں میں صحرا چھوڑ کر

مجھ پہ پتھر پھینکنے والوں کو تیرے شہر میں
نرم و نازک ہاتھ بھی دیتے ہیں پتھر توڑ کر

بس رہا ہوں آج اس ماحول میں ساجدؔ جہاں
لوگ باراتوں میں جاتے ہیں جنازے چھوڑ کر

•

○

ختم راتوں رات اُس گُل کی کہانی ہو گئی
رنگ بوسیدہ ہوئے، خُوشبو پُرانی ہو گئی

جس سے روشن تھا مقدّر، وہ ستارہ کھو گیا
ظلمتوں کی نذر آخر زندگانی ہو گئی!

کل اُجالوں کے نگر میں حادثہ ایسا ہوا
چڑھتے سورج پر دِیئے کی حکمرانی ہو گئی

رہ گئی تھی لعل بننے میں کمی اک آنچ کی
آنکھ سے گر کر لہو کی بُوند پانی ہو گئی

چِلّہ جاں پر چڑھا کر آخری سانسوں کے تیر
موت کی سرحد میں داخل زندگانی ہو گئی

خوف اب آتا نہیں ہے، سیپیاں چُنتے ہوئے
دوستی اپنی سمندر سے پُرانی ہو گئی

کس جگہ آیا ہے تُو، آنکھوں کے نیلم بھول کر؟
گُم کہاں اقبال ساجدؔ کی نشانی ہو گئی؟

ماہِ نوص 64 دسمبر 1979ء

○

عجب صدا یہ نمائش میں کل سنائی دی
کسی نے سنگ سے تصویر کو رہائی دی

سُنہری حرف بھی مٹی کے بھاؤ بیچ دیئے
تجھے تو میں نے نئے ذہن کی کمائی دی

بچا سکی نہ مجھے بھیڑ، چُپ کے قاتل سے
ہزار شور مچایا، بہت دُہائی دی

وہ شخص مر کے بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکا
اگرچہ دہر نے جنبش تو انتہائی دی

کبھی وہ ٹوٹ کے بکھرا، کبھی وہ جمع ہوا
خدا نے اس کو عجب معجزہ نمائی کی

"اردو زبان"

○

قدرت نے روشنی کا سہارا نہیں دیا
قسمت تو بخش دی ہے ستارا نہیں دیا

یہ اپنا حوصلہ ہے، وہ دریا کیا عبور
جس کو خدا نے کوئی کنارہ نہیں دیا

بستی بھی تھوڑی دور تھی اپنے الاؤ سے
یوں بھیک میں ہوا کو شرارہ نہیں دیا

جس نے لیا ہے قرض میں ہم سے لیا ہے دل
لوٹایا جس نے اس کو دوبارہ نہیں دیا

خود کاروبارِ عشق میں قلّاش ہو گئے
ساؔجد کسی کو ہم نے خسارہ نہیں دیا

○

کاٹی نہیں تو اور بھی، پھیلے گی شاخ جبر کی
صبر کی بات چھوڑیئے، ہوتی ہے حد بھی صبر کی

ڈھونڈ اب ایسی سرزمیں، جس کی تمام کھیتیاں
مانگیں نہ آسمان سے، بھیک کبھی اَبر کی

کرب کا بحرِ بیکراں، چاروں طرف ہے موجزن
گھر میں گھڑی مقیم ہے، کب سے عذابِ قبر کی

پہلے تو گھر کے صحن میں، دُھوپ کی برچھیاں گریں
بعد میں چھت پہ آ گئی، فوج غنیمِ ابر کی

صحن میں پُھول پُھول جسم، کھیل رہے ہیں ہر طرف
خوف نہیں ہے دھوپ کا، فکر نہیں ہے ابر کی

صبر کی بیل تو منڈھے، چڑھ نہ سکی مرے خدا
دہر میں دُھوم دھام سے، رسم چلی ہے جبر کی

بھیک میں لے کے اُجرتیں، آئے تو پاؤں جَھڑ گئے
پھاند سکے نہ اس لئے، لوگ فصیل جبر کی

راہِ مُراد اِس لئے، اور بھی دُور ہو گئی
اُس میں تھا قحطِ حوصلہ، مجھ میں کمی تھی صبر کی

نقوش لاہور ص 612

○

نازک نظر پہ بار، یہ نازک سماں ہے آج
پانی پہ عکس، شاخ پہ پتّہ گراں ہے آج

چہرے پہ روشنی کی بجائے دُھواں ہے آج
خالی مہ و نجوم سے یہ آسماں ہے آج

ویراں پڑی ہوئی ہے مرے دل کی سلطنت
پہلے تھا حکمراں، نہ کوئی حکمراں ہے آج

دل کا یہ کوہِ نور، کسی کی نگاہ میں
کل تک تو قیمتی تھا مگر رائیگاں ہے آج

کھینچی ہے تو نے آنکھ میں کاجل کی وہ لکیر
جس کی فضا میں گرد، صفِ کہکشاں ہے آج

دامن جو اعتماد کے پھولوں سے بھر سکے
دُنیا کی وُسعتوں میں یہ وُسعت کہاں ہے آج؟

تجھ میں ہے یہ کمال کہ میں بے کمال ہوں
پرکھے جو مجھ کو ایسی کسوٹی کہاں ہے آج؟

اے دوست میں بھی اس کی بُلندی کی داد دوں
آئے اگر زمیں پہ کوئی آسماں ہے آج؟

چھینیں نہ آپ مجھ سے مرے دل کا اضطراب
لے دے کے میرے پاس یہی رازداں ہے آج

جائے نہ دوستو کوئی شُہرت کے بام پر
دنیا میں انتقام کا سورج جواں ہے آج

آنکھیں اگر کُھلی ہوں تو دنیا کے واسطے
ہر شخص اک صحیفۂ عبرت نشاں ہے آج

جُگنو سے اُڑ رہے ہیں فضائے بسیط میں
خوابوں کی جنتّوں میں کوئی ضَوفشاں ہے آج

دیتا ہے ہر قدم پہ مجھے نت نئے فریب
مجھ سا ہی ایک شخص، جو مجھ میں نہاں ہے آج

سُونا پڑا ہوا ہے یہ بازارِ رنگ و نُور
پہلی سی شہرِ دل میں وہ رونق کہاں ہے آج؟

آنکھوں میں اُڑ رہی ہے، فریبوں کی گرم ریت
جھیلوں کی بستیوں میں دُھواں ہی دُھواں ہے آج

ساجد ہے اُنکی آنکھ میں کاجل کی وہ لکیر
جس کی فضا میں گردِ صفِ کہکشاں ہے آج

دو شعر

سطح پر رکھا تھا پیمانہ کہ ہلچل مچ گئی
لطف آیا ناپ کے دریا کی گہرائی مجھے

یوں لگا جیسے غُباروں میں ہوا پتھرائی گئی
چھُو کے ساجد اُن چھُوئی سطحوں کی گولائی مجھے

○

سوچا تھا اُس نے رات کی چُپ میں مجھے ملے
لیکن ہوا نے راہ میں پتّے گرا دیئے

وہ شخص میرے واسطے اک واہمہ بنا
میرے ہی جسم سے میرے بازو لپٹ گئے

میری ہے وہ مثال کہ جیسے کوئی درخت
دُنیا کو چھاؤں بخش کے خود دُھوپ میں جلے

اچھّوں کے ساتھ رہ کے گزاری ہے ایک عمر
کچھ دن بُروں کا ساتھ نبھا کر بھی دیکھیے

کاٹو اسے اُجاڑ سمجھ کر نہ دوستو
اس پیڑ کے تنے پہ ہیں دو دل بنے ہوئے

ساجدؔ بنا رہا تھا خلاؤں میں اُسکی شکل
پھر سوچنے لگا کہیں دُنیا نہ دیکھ لے

○

کمانِ شب سے سحرکار تیر چھوڑ گیا
ستارہ ٹُوٹ کے روشن لکیر چھوڑ گیا

اب اس میں زہر ملاؤ کہ تم مٹھاس پیو
پہاڑ کاٹ کے وہ جُوئے شیر چھوڑ گیا

یہ اور بات کہ اس پر کوئی چلے نہ چلے
لکیر چھوڑنے والا لکیر چھوڑ گیا

پھر آج شہر کی سب سے بڑی حویلی میں
تمام دن کی کمائی فقیر چھوڑ گیا!

زمینِ سنگ پہ وہ آئینہ بکف ساجدؔ
جو عکس چھوڑ گیا بے نظیر چھوڑ گیا

○

کسی بھی شاخ سے خیرات گھر لے کر نہیں آئے
گئے تھے باغ میں لیکن ثمر لے کر نہیں آئے

ہم اپنے کاغذی پھولوں کی خاطر مُفت کی خُوشبو
چمن سے لا تو سکتے تھے مگر لے کر نہیں آئے

ہمارے شب زدوں کو قرض کی عادت نہ پڑ جائے
اُجالوں کے نگر سے یوں سحر لے کر نہیں آئے

مسافر تو مسافت کی نشانی ساتھ لائے ہیں
مگر ہم کوئی سوغاتِ سفر لے کر نہیں آئے

وہاں ہر شہر کے پہلو میں اک لوہے کا جنگل تھا
مگر اک شاخِ پیوندی بھی گھر لے کر نہیں آئے

وہ گرد آلود چہرے جن کا مستقبل سُنہری ہے
ہم ان کی راہ سے گردِ سفر لے کر نہیں آئے

اسی اُمّید پر زر کی گھٹائیں خود تراشیں گے
پرائی چمنیوں سے ابرِ زر لے کر نہیں آئے

دُھوئیں کے زرگروں سے ہم نے ساجدؔ کچھ نہیں سیکھا
گرہ میں گُر نہیں باندھا، ہُنر لے کر نہیں آئے

○

تم مجھے بھی کانچ کی پوشاک پہنانے لگے؟
میں جسے دیکھوں، وہی پتھر نظر آنے لگے

بےسبب گھر سے نکل کر آ گئے بازار میں
آئینہ دیکھا نہیں، تصویر چھپوانے لگے

دشت میں پہنچے تو تنہائی مکمل ہو گئی
بڑھ گئی وحشت تو پھر خود سے ہی ٹکرانے لگے

خون کا نشّہ چڑھا تو جسم زہریلا ہوا
خواہشوں کے پانیوں میں سانپ لہرانے لگے

کچھ نہیں ہے ذہن میں تو وہم کی شکلیں بنا
روشنی ہو گی اگر سائے نظر آنے لگے

دیکھنا چاہا، تو وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا
چُومنا چاہا، تو میرے ہونٹ پتھرانے لگے

رنگ آخر لے ہی آیا، میری سوچوں کا جمُود
برف کے سورج بلا کی دُھوپ پھیلانے لگے

چل پڑے تو ہو لئے اقبال ساجد اپنے ساتھ
تھک گئے تو اپنے ہی سائے میں سستانے لگے

فنون ص 395 شمارہ 4- 3 جولائی' اگست 1966ء

○

پیاسے کے پاس رات، سمندر پڑا ہوا
کروٹ بدل رہا تھا، برابر پڑا ہوا

باہر سے دیکھئے تو بدن ہیں ہرے بھرے
لیکن لہو کا کال ہے، اندر پڑا ہوا

دیوار تو ہے راہ میں سالم کھڑی ہوئی
سایہ ہے درمیان سے کٹ کر پڑا ہوا

اندر تھی جتنی آگ وہ ٹھنڈی نہ ہو سکی
پانی تھا صرف گھاس کے اُوپر پڑا ہوا

ہاتھوں پہ بہہ رہی ہے، لکیروں کی آبجو
قسمت کا کھیت پھر بھی ہے بنجر پڑا ہوا

یہ خود بھی آسمان کی وُسعت میں قید ہے
کیا دیکھتا ہے چاند کو چھت پر پڑا ہوا؟

جلتا ہے روز شام کو، گھاٹی کے اُس طرف
دن کا چراغ جھیل کے اندر پڑا ہوا

مارا کسی نے سنگ تو ٹھوکر لگی مجھے
دیکھا تو آسماں تھا زمیں پر پڑا ہوا

فنون ص 137 شمارہ 5۔ 4 فروری' مارچ 1966ء

○

یہ بھی خودداری تھی' ظاہر بے بسی کرتے رہے
زندہ رہنے کے لئے ہم خودکشی کرتے رہے

ساری دنیا جانتی ہے ہم تو اُن میں سے نہیں
جو وفا کے نام پر سوداگری کرتے رہے

اب مرے حُسنِ نظر پر کر رہے ہیں اعتراض
حُسن میں حاصل جو مجھ سے برتری کرتے رہے

کھوٹ اپنے دل میں رکھا ہے، نہ رکھیں گے کبھی
جو بھی آیا سامنے، باتیں کھری کرتے رہے

منجمد تھے جسم جن کے اور تھے پتّھر کے ہاتھ
شہر میں وہ پیشہ، شیشہ گری کرتے رہے

یہ جہاں ایّوب بھُولا ہے انہی کے نام کو
جو بھی اس ظلمت کدے میں روشنی کرتے رہے

○

ہر گھڑی کا ساتھ دُکھ دیتا ہے، جانِ من مجھے
ہر کوئی کہنے لگا تنہائی کا دُشمن مجھے

دن کو کرنیں، رات کو جگنو پکڑنے کا ہے شوق
جانے کس منزل پہ لے جائے گا، پاگل پَن مجھے

سادہ کاغذ رکھ کے آیا ہوں، نمائش گاہ میں
دیکھ کر ہوتی تھی ہر تصویر کو اُلجھن مجھے

ناچتا تھا پاؤں میں لمحوں کے گھنگھرُو باندھ کر
دے گیا دھوکہ سمٹ کر وقت کا آنگن مجھے

نیکیوں کے پھل نہیں لگتے، بدی کے پیڑ پر
اُس نے واپس کر دیا ہے پھر تہی دامن مجھے

دوستو! سُن لی خُدا نے کل مری پہلی دعا
شرم سے آخر جھکانی پڑ گئی گردن مجھے

کیا ملا تجھ کو بتا، اندھے سے لاٹھی چھین کر
کر دیا کیوں آس سے محروم جانِ من مجھے

سرد ہو سکتی نہیں ساجد کبھی سینے کی آگ
دِل جلانے کو ملا ہے یاد کا ایندھن مجھے

فنون ص 557 جنوری 1969ء

○

ڈھونڈتے ہیں لوگ کوڑی مکر کی ، فن کے لئے
جُستجو کرتے ہیں کوتاہی کی ، دامن کے لئے

آگ بھڑکانے کو آخر آ گئیں لوگوں کے ہاتھ
خون کی چنگاریاں ، جسموں کے ایندھن کے لئے

جانے کب دل پر کوئی شک کی لکیریں کھینچ دے
ذہن کو تیار رکھ ، ہر وقت اُلجھن کے لئے

میں خلاؤں کو پہن کر بھی برہنہ ہو گیا
جستجو بیکار کی پیراہنِ تن کے لئے

رات پھر جلنے لگی ہر موج لکڑی کی طرح
چاند شُعلہ بن گیا، دریا کے دامن کے لئے

لَوٹ کر ساجدؔ کماں میں تیر آ سکتا نہیں
کیوں جواں راتوں میں خوں روتا ہے، بچپن کے لئے؟

فنون شمارہ 3 جولائی 1968ء

○

وہ میری بات کے لہجے سے ڈر گیا شاید
چھپا تھا اس میں وہ انسان مر گیا شاید

ٹھکانہ اُس کا نہیں اپنی انجمن کے سوا
یہاں سے اُٹھ کے گیا ہے تو گھر گیا شاید

اسے تو دیکھا نہیں میں نے آج ساحل پر
وہ آج دریا کی تہہ میں اُتر گیا شاید

وسیلہ جان کے در پر نہ میرے دستک دی
یہی کہ اس کا نصیب اب سنور گیا شاید

مرا تو ہے یہی احساس اس کے بارے میں
یہاں سے وہ کسی دوجے نگر گیا شاید

○

ترے چہرے پہ ہے گر آنکھ پُرانی کوئی
مجھ سے مت مانگ، نئے فن کی نشانی کوئی

نقش ہے سب کے دِلوں پر مری تحریر، مگر
میں جو پوچھوں، تو بتائے نہ معانی کوئی

قصّہ گوئی پہ تجھے ناز بہت ہے، تو سُنا
جس میں کردار نہ ہو، ایسی کہانی کوئی

وہی میں نے بھی کیا، جو میرے دل میں آیا
اور اس نے بھی میری بات نہ مانی کوئی

کون کافر ہے کہ ایمان نہ لائے تجھ پر؟
تُو قیامت ہے تو پھر بھیج نشانی کوئی

کون دیتا ہے کنارے کو، کنارے کی خبر
موج کرتی نہیں پیغام رسانی کوئی

زندگی بھیک کی صورت میں ملی ہے سب کو
پا کے اترائے نہ پوشاک پُرانی کوئی

آگ پانی میں لگا دیں گے، لگانے والے
اور شُعلوں سے نچوڑے گا نہ پانی کوئی

جو بھی سستا تھا، وہی بک گیا مہنگا ہو کر
مجھ سے خود پر نہ چڑھا، رنگِ گرانی کوئی

فائدہ نام کی شُہرت سے اُٹھا لے ساجد
بھیج اخبار کو تصویر پُرانی کوئی

فنون ص 440 مئی، جون 1969ء

○

دُنیا کی کیا مجال، چمن سے نکال دے؟
مجھ کو حدودِ ملکِ سخن سے نکال دے

طاقت تو ہے عدُو میں مگر حوصلہ نہیں
ورنہ مری زبان دہن سے نکال دے

کیا سوچتا ہے، کاٹ رگ و پے کی رسّیاں
اب خون کا عذاب بدن سے نکال دے

ہاتھوں کو خود صلیب بنا، اپنے واسطے
موقع ہے، زندگی کو گھٹن سے نکال دے

سورج کو سب کے سامنے اب بےنقاب کر
ظلمت کا زہر پہلی کرن سے نکال دے

پہنائے وُسعتوں کو نیا دائرہ کوئی
اِس چرخ کو نظامِ کُہن سے نکال دے

پھر دوسروں کے واسطے خُوشیوں کا باب کھول
خود کو تو قیدِ رنج و مُحن سے نکال دے

مانگی ہے مجھ سے کس نے نئی نیکیوں کی بھیک؟
کس نے کہا زکوٰۃ سخن سے نکال دے؟

سینے سے پھر لگائیں گے تجھ کو پُرانے لوگ
ساجد جدیدیّت کو تو فن سے نکال دے

نقوش ص 318 جنوری 1976ء

○

قتل ہو جائے گا، ڈکٹیٹر نہ بن، ضد چھوڑ دے
چھوڑ دے تختِ سُخن، اقبال ساؔجد چھوڑ دے

دفن ہو جائے گا تیرا دینِ جدّت، ایک دن
شاعری کا اکبرِاعظم نہ بن، ضد چھوڑ دے

ذہن و دل کے چھاپہ خانے میں، ادب کے نام پر
چھاپنا غزلوں کے اغراض و مقاصد چھوڑ دے

دیکھ بیٹے! اچھے بچّے ضد کیا کرتے نہیں
مان لے اپنے بزرگوں کا کہا، ضد چھوڑ دے

ریزگی کا ڈر ہے تو ہٹ جائے میری راہ سے
خود بخود رستہ مرا ہر سنگِ جامد چھوڑ دے

ذہن کی چھتری سے، سوچوں کے کبُوتر اُڑ گئے
نفرتوں کے باز اِن پر میرے حاسد چھوڑ دے

آنکھ کے پتھر کو پھر اشکوں کی دِیمک لگ گئی
عین ممکن ہے جگہ یہ سنگِ جامد چھوڑ دے

ایسے آنسو رو، کسی نے آج تک روئے نہ ہوں
قتل گاہِ دہر میں روشن شواہد چھوڑ دے

یہ ترے اشعار، تیری معنوی اولاد ہیں
اپنے بچّے بیچنا، اقبال ساؔجد چھوڑ دے

فنون ص 120 جولائی، اگست 1973ء

○

ٹُوٹیں گی جب طنابیں، رہ جائیں گے سُکڑ کے
کھنچ کر بڑے ہوئے ہیں، یہ آدمی ربڑ کے

ٹانگوں سے بانس باندھے' شوقِ قدآوری میں
بونے بھی راستوں میں، چلنے لگے اکڑ کے

یہ خواہشیں کہ جیسے، آوارہ لڑکیاں ہوں
ارماں ہیں شہرِ دل میں، یا بدقماش لڑکے

جذبے نکل گئے تھے، سینے کی کوٹھڑی سے
مفرور قیدیوں کو، لایا ہوں پھر پکڑ کے

چہرے کی سرجری پر ، میں کھا گیا تھا دھوکا
پہلے ہی مرحلے پہ، وہ رہ گیا اُجڑ کے

اے دوست تجھ کو پا کر، اتنی خُوشی ہوئی ہے
خوش جیسے ہو شکاری، مچھلی کوئی پکڑ کے

"ادبی دنیا" ص 103 شمارہ 46 ستمبر 1972ء

○

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و دَر میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو، ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

دِکھاوے کے لئے خُوشحالیاں لکھتے ہیں کاغذ پر
ہم اس دھرتی پر ورنہ رِزق کے چکّر میں رہتے ہیں

ضرورت ہی لئے پھرتی ہے ہم کو دربدر ورنہ !!
ہم اُن میں سے نہیں جو جستجوئے زَر میں رہتے ہیں

لہو سے جو اُٹھائی تھیں وہ بُنیادیں نہیں اپنی
یہی محسوس ہوتا ہے پرائے گھر میں رہتے ہیں

کبھی بیداریاں قسمت تھیں، اب نیندیں مقدّر ہیں
ہمارا کیا ہے ہم تو شہرِ خواب آور میں رہتے ہیں

مزا مل جائے گا تجھ کو بھی سنگِ راہ بننے کا
ترے جیسے تو مرے پاؤں کی ٹھوکر میں رہتے ہیں

وہ خُوشبودار چہرے جو نگاہ و دل کا مرکز تھے
خدا جانے بچھڑ کر ہم سے کس محور میں رہتے ہیں

دُکھوں کے باغ میں ہر وقت شاخِ زخم پھلتی ہے
ازل سے یہ شجر، کربِ ثمر آور میں رہتے ہیں

کوئی شہکارِ فن تکمیل کا دعویٰ نہیں کرتا
اُدھورے پن کے دُکھ ساجد ہر اک پیکر میں رہتے ہیں

○

نئے زمانے میں، اِن کا جواز کچھ بھی نہیں
فراقؔ و فیضؔ و ندیمؔ و فرازؔ کچھ بھی نہیں

نہ اِن کا لہجہ نیا ہے، نہ اِن کی سوچ نئی
یہ فکر گر، نظریہ طراز کچھ بھی نہیں

لکھیں اُصول، مگر اپنی منفعت کے لئے
کُھلا یہ راز کہ یہ نعرہ باز کچھ بھی نہیں

غزل لکھے جو فقط اس لئے کہ گائی جائے
مری نظر میں تو وہ شعر ساز کچھ بھی نہیں

پُرانے ناموں کے بوسیدہ اشتہاروں کا
فصیلِ ملکِ سخن پر، جواز کچھ بھی نہیں

وہ لوگ اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھیں
ہمیں جو کہتے ہیں، جدّت طراز کچھ بھی نہیں

ہے نسلِ نَو سے خُدا واسطے کا بَیر انہیں
وگرنہ بُغض و حسد کا جواز کچھ بھی نہیں

ہے اتّحاد کا موسم، جدیدیو اُٹھو
لگا نعرہ، قدامت نواز کچھ بھی نہیں

مشینی دور میں کیا قصّۂ لب و رُخسار
حکایتِ شبِ زُلفِ دراز کچھ بھی نہیں

اگست 1984ء گلاب دیوی ہسپتال لاہور

○

مُہرے بھی غلط اُسکے، وہ شاطر بھی غلط ہے
باطن ہی نہیں، اُسکا تو ظاہر بھی غلط ہے

ترتیب کا قائل ہے، نہ بکھراوَ کا قائل
اب اُس کے لئے رنگِ عناصر بھی غلط ہے

انکار کی خُو پر بھی وہ قائم نہیں رہتا
سچ پوچھئے مجھ سے تو وہ مُنکر بھی غلط ہے

پھر کون کرے دہر میں منزل کا تعیّن؟
رستہ بھی نہیں ٹھیک، مسافر بھی غلط ہے

کرتا ہے ہمیشہ سے وہ پرواز پرائی
اُس شخص کی اُمّید کا طائر بھی غلط ہے

مہنگائی کے بازار میں، ہوتی ہے بہت بھیڑ
گاہک ہی نہیں، شہر کا تاجر بھی غلط ہے

انساں تو غلط اپنی غریبی کے سبب ہے
کہہ دیجئے ساجدؔ کہ وہ شاعر بھی غلط ہے

جون 1987ء گلاب دیوی ہسپتال لاہور

○

عجیب شخص ہے، پھرنے لگا ہر آن لئے
زمین پاؤں میں اور سر پر آسمان لئے

سُنا ہے کل وہی بھونچال سے رہے محفوظ
جنھوں نے اپنے سروں پر مکان تان لئے

زمین والے بھی اُن سے وصول کر نہ سکے
لگان ہاتھ میں پھرتے رہے کسان لئے

خُدا نہیں ہوں مگر اُس کے باوجود سمجھ
کہ تیرے دل کے سبھی بھید میں نے جان لئے

مجھے یہ فخر ہے، میں ذہن کا نہیں ننگا
قدم قدم نظر آتا ہوں اپنی شان لئے

شعور کیا' وہ ہوا لاشعور سے عاری
اِسی لئے تو سبھی قول اُسکے مان لئے

اشارہ کرتا ہے ساجدؔ' نہ بول سکتا ہے
کئی برس ہوئے منہ میں اسے زبان لئے

ماہِ نو اکتوبر 1985ء

○

درِ دل کھول کے مصروف ہو گھر کو سجانے میں
نجانے کون، کب آ جائے، اس تنہائی خانے میں

اگر ایسا نہ کرتا رابطہ دنیا سے کٹ جاتا
ہوا میں کامیاب آخر اکیلا پن چھُپانے میں

سبھی کو شہر میں احساس ہے بے شکل ہونے کا
کئی برسوں سے قحطِ عکس ہے آئنہ خانے میں

فساد ایسا ہوا کل شب کہ خلقت دیکھنے آئی
اچانک زر چلا آیا تھا مُفلس کے گھرانے میں

پڑے ساجد نہ کیونکر کال اب ہر سُو ہرے پن کا
کہ بنجر لوگ پیدا ہو رہے ہیں اِس زمانے میں

○

کل کو جاری قتل کا فرمان بھی ہو جائے گا
دستخط تو ہو چکے' اعلان بھی ہو جائے گا

غیر کے کالے سمندر میں گرا دے گا کوئی
میں اگر دریا ہوں' وہ ڈھلوان بھی ہو جائے گا

شب سیاہی بھی مری قسمت میں لکھی جائے گی
اور طلوعِ صُبح کا اعلان بھی ہو جائے گا

رفتہ رفتہ حسرتوں کی آگ بھی برفائے گی
آنسوؤں کا منجّمد طوفان بھی ہو جائے گا

خواہشیں ننگے بدن ناچیں گی، دل کے سامنے
یہ فرشتہ دیکھنا شیطان بھی ہو جائے گا

جسم کے اندر لہو کی فصل بھی اُگ آئے گی
ایک دن پورا مرا نقصان بھی ہو جائے گا

خاکِ دل سے ایکدن اُٹھے گا سورج کا خمیر
پُر کبھی کرنوں سے روشن دان بھی ہو جائے گا

سب قصوُر اس کا سہی لیکن خطا اپنی بتا
بات بھی بن جائے گی' احسان بھی ہو جائے گا

رفتہ رفتہ آئے گی اقبال ساجد کو بھی عقل
جانور سے یہ کبھی انسان بھی ہو جائے گا

اوراق ص 287 اپریل' مئی 1975ء

○

عہدِ جدید تر کا نمائندہ کون ہے؟
گر میں نہیں تو اور یہاں زندہ کون ہے؟

کس نے نئے سخن کی بسائی ہیں بستیاں؟
جو خود اُجڑ گیا ہے وہ باشندہ کون ہے؟

تنہا ہے کون، کس کے یہ بازو ہیں ان گنت؟
تھامے ہوئے یہ پرچمِ آئندہ کون ہے؟

اب بھی نئے اُفق پہ ہیں بوسیدہ آفتاب
دیمک زدہ شُعاعوں پہ شرمندہ کون ہے؟

شبنموں کچھ ایسا مارا ہے جگنو نے چاند پر
لوگوں سے پوچھتا ہے کہ تابندہ کون ہے؟

گو منجمّد ہے ذہن مگر سوچتے ہیں لوگ
مُردہ ہے لفظ کون سا اور زندہ کون ہے؟

یہ لوگ اب بھی پچھلی صدی کے اسیر ہیں
سآجد سفیرِ لمحۂ آئندہ کون ہے؟

ماہنامہ "فنون" ص 14 ، اپریل، مئی 1971ء

○

سحر شعاعوں میں شبنم پرو کے لائی دیکھ
اُٹھ آنکھ کھول کے منظر کی خوشنمائی دیکھ

اُلٹ دی شام کو سورج نے روشنی کی دَوات
فضا میں پھیل گئی سرخ روشنائی دیکھ

سفید پھول مہکتے ہیں، شَب کی چادر پر
ہوئی ہے نُقرئی تاروں سے کیا کڑھائی دیکھ

اُلٹ رہی ہے صبا، سبز پتّیوں کے وَرق
کلی کلی کی چمن میں گرہ کشائی دیکھ

اُگا نہ سبزہ، تو اُس نے اُجاڑ گھر کی مُنڈیر
پلاسٹک کی ہری بیل سے سجائی دیکھ

لگا کے صحن میں کاغذ کے پھُول، خوش ہے بہت؟
وہ خلق ہاتھ میں پتّھر اُٹھا کے لائی دیکھ

وہ سطحِ گنگ و جمن پھر سے ہو گئی رنگیں
لہو سے سرخ ہوئی ساحلوں کی کائی دیکھ

سجائی جاتی ہے نیکی تو اب نمائش میں
بہائی جاتی ہے دریاؤں میں بُرائی دیکھ

ہے تیرے سامنے ساجدؔ، مثال غالبؔ کی
پُرانی ہو نہیں سکتی نئی لکھائی دیکھ

فنون ص 48 فروری 1970ء

○

سرسبز دل کی کوئی بھی خواہش نہیں ہوئی
وہ ہے زمینِ دل جہاں بارش نہیں ہوئی

روئے ہوئے بھی ان کو کئی سال ہو گئے
آنکھوں میں آنسوؤں کی نمائش نہیں ہوئی

دیوار و در ہیں پاس مگر ان کے باوجود
اپنے ہی گھر میں اپنی رہائش نہیں ہوئی

بابِ سخن میں اب وہی مشہور ہو گئے
وہ جن کے ذہن سے کوئی کاوش نہیں ہوئی

○

گڑے مُردوں نے اکثر زندہ لوگوں کی قیادت کی
مری راہوں میں بھی حائل ہیں دیواریں قدامت کی

نئی کرنیں، پُرانے آسماں پر کیوں جگہ پائیں؟
وہ کافر ہے کہ جس نے چڑھتے سُورج کی عبادت کی؟

پُرانی سیڑھیوں پر میں، نئے قدموں کو کیوں رکھوں؟
گراؤں کس لئے چھت سر پہ، بوسیدہ عمارت کی

ترا احساس بھی ہو گا کبھی میری طرح پتھّر
نکل جائے گی آئینے سے پرچھائیں نزاکت کی

وہ میرا بُت تھا، جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے توڑا
کہ برسوں کی یہ محنت، ایک لمحے میں اکارت کی

اگر ہے نام کی خواہش، تو دیواروں پہ چسپاں کر
بنا کر جھُوٹ کے رنگوں سے تصویریں صداقت کی

ابھی سینوں میں لہراتے ہیں تیری یاد کے پرچم
ابھی تک ثبت ہیں مُہریں دِلوں پر بادشاہت کی

ابھی سب حرف ہیں تازہ، مُکرتا کیوں ہے معنی سے؟
سیاہی خُشک بھی ہونے نہیں پائی عبارت کی

کوئی میٹھے پھلوں کی آس میں کیوں تلخ دن کاٹے؟
کسے فرُصت ہے ساؔجد آج کل صبر و قناعت کی؟

فنون ص 235 اپریل 1968ء

○

بدن پر مَیل اور چہرے پہ گردِ راہ کا رہنا
کوئی رہنا یہاں ہے شخصِ بے تنخواہ کا رہنا

کسی دن اپنی حیثیت گنوا بیٹھے گا ساحل پر
سمندر کے قریب اچھا نہیں ہے چاہ کا رہنا

مرا سینہ بھی گویا وادیٔ تاریک ٹھہرا ہے
کہ اس بستی میں رہنا ہے دلِ گُمراہ کا رہنا

کئی برسوں کے بعد آخر فلک نیچے اُتر آیا
بہت اچھا لگا دھرتی پہ مہر و ماہ کا رہنا

زمانہ کہہ رہا ہے جب خُدائے شاعری مجھ کو
مرے چہرے پہ سجتا ہے جلال و جاہ کا رہنا

○

کیا سوچتا ہے، یاد کا سورج طلوع کر
چوپال بھر چُکی ہے، کہانی شروع کر

آئے نہ حرف خود ہی ترے سرد و گرم پر
دریافت تُو نہ اسکا محلِ وقوع کر

دربارِ شاہِ وقت کے آداب بھی تو سیکھ
سجدہ تو کرنا بعد میں، پہلے رکوع کر

تفتیش اپنے ہاتھ میں لے، اپنے قتل کی
خود ہی تلاش شہر میں جائے وقوع کر

ساجدؔ بچھا کے بوریا دل کا نماز میں
ظاہر طریقِ حُسنِ خضُوع و خُشوع کر

○

بُھوک جس نے اُتاری مرے جسم پر' بے بہا اُس نے مجھ پہ کرم بھی کیا
میری سوچوں کو شادابیاں بخش دیں' میرے لفظوں کو رزقِ معانی دیا

غیر کا رِزق کیوں میری جھولی بھرے' اے خدا یہ گوارہ نہیں تھا مجھے
میری خُوئے قناعت نے اس واسطے' دعوتِ جشنِ نعمت کو رَد کر دیا

اے شبِ مُفلسی کچھ سبب تو بتا' مجھ سے ناراض ہو کر گئی تھی کہاں ؟
کس کے آنگن میں تُو نے اُتاری تھکن' کس کے غُربت کدے میں بسیرا کیا

دوست یہ بھی غنیمت ہے اِس شہر میں ' ڈیڑھ مرلے کا گھر ہے میسّر مجھے
خیر مانگوں نہ اِس سرزمیں کی میں کیوں ' سر چُھپانے کو جس نے ٹھکانہ دیا

○

سنگ دل ہوں اس قدر آنکھیں بھگو سکتا نہیں
میں کہ پتھریلی زمیں میں پھول بو سکتا نہیں

لگ چکے ہیں دامنوں پر جتنے رُسوائی کے داغ
ان کو آنسو کیا، سمندر تک بھی دھو سکتا نہیں

ایک دو دُکھ ہوں تو پھر ان سے کروں جی بھر کے پیار
سب کو سینے سے لگا لوں، یہ تو ہو سکتا نہیں

تیری بربادی پہ اب آنسو بہاؤں کس لئے؟
میں تو خود اپنی تباہی پر بھی رو سکتا نہیں

جس نے سمجھا ہو ہمیشہ دوستی کو کاروبار!!!
دوستو' وہ تو کسی کا دوست ہو سکتا نہیں

خواہشوں کی نذر کر دوں کس لئے انمول اشک
کچّے دھاگوں میں کوئی موتی پرو سکتا نہیں

میں ترے در کا بھکاری' تُو مرے در کا فقیر
آدمی اس دور میں خود دار ہو سکتا نہیں

مجھ کو اتنا بھی نہیں ہے سرخرو ہونے کا شوق
بے سبب تازہ لہو کی فصل بو سکتا نہیں

یاد کے شعلوں پہ جلتا ہے اگر میرا بدن
اوڑھ کر پھولوں کی چادر تُو بھی سو سکتا نہیں

ہاتھ جس سے کچھ نہ آئے' اس کی خواہش کیوں کروں
دودھ کی مانند میں پانی رِبلو سکتا نہیں

○

خوشی کے جشن میں رنج و ملال جیت گیا
ہمارے چہرے کا ہر خدّوخال جیت گیا

حسین چہروں میں کس کا کمال جیت گیا؟
یہ کون صاحبِ حُسن و جمال جیت گیا؟

نظر ملا نہ سکا مجھ سے وہ سرِ مَسند
پھر اِس برس مرا جاہ و جلال جیت گیا

مری دلیل سے بڑھ کر کوئی دلیل نہ تھی
میں دے کے خود وہاں اپنی مثال جیت گیا

شکست کھا گئی سرسبز فصلِ خُوشحالی
پڑاؤ ڈال کے کھیتوں میں کال جیت گیا

پُرانے فن کو نئے پَن نے کر دیا مسمار
کہ ماضی ہار گیا اور حال جیت گیا

خفا ہیں لوگ یوں ساجد کی فتح کامل پر
بساطِ فن پہ یہ کیوں چل کے چال جیت گیا

چھ مارچ 1986ء

○

سُنا احوال تیرے شہر کے معیار کیسے ہیں؟
مکیں کیسے ہیں اس کے اور درودیوار کیسے ہیں؟

جہاں رہتا ہے تُو، اُس خاک کی تاثیر کیسی ہے؟
پھلوں کا ذائقہ کیسا ہے اور اشجار کیسے ہیں؟

اُبھر کر سامنے آتے ہیں یا چھُپتے ہیں نظروں سے
کہانی گھومتی ہے جن پہ وہ کردار کیسے ہیں؟

وہاں مزدور کی اُجرت ادھُوری ہے کہ پوری ہے؟
مزاجاً اور ذہناً کارخانے دار کیسے ہیں؟

تجھے احساسِ آزادی ہے یا خوفِ اسیری ہے؟
فضا کیسی ہے تیرے گھر کی' پہریدار کیسے ہیں؟

ترے چہرے سے ظاہر ہے بہت ہی مطمئن ہے تُو
عبارت کہہ رہی ہے معنی و معیار کیسے ہیں

مَیں اپنے مرکز و محور سے کب کا کٹ چُکا ساجدؔ
کسی کو کیا بتاؤں ثابت و سیّار کیسے ہیں

○

میں نے جب بچپن کو لَوٹایا سہارے چِھن گئے
کھیلنا چاہا، تو ہاتھوں سے سہارے چِھن گئے

موم کی پُتلی نچاتا تھا، کرن کی ڈور سے
ہاتھ کچھ اس طرح پتھرائے اشارے چِھن گئے

اس نے یہ کہہ کر دُکانِ سنگ میں رکھا مجھے
یہ ہے وہ آئینہ جس کے عکس سارے چِھن گئے

لُوٹ کچھ ایسی مچی تھی، دن دہاڑے شہر میں
کل سپیروں سے بھی سانپوں کے پٹارے چھن گئے

لُٹ گئے بازار میں میرے بھی سب پتھر کے چاند
اس کے ہاتھوں سے بھی مٹی کے ستارے چھن گئے

اپنی زمین ص 9 ‘ شمارہ 1 جولائی 1971ء

○

انسان کوئی ایسی تصویر بھی بنائے
دیکھے خدا بھی جس کو حیرت میں ڈوب جائے

کھینچے وہ عکسِ امکاں جس کا نہیں ہو ثانی
امکان کی بھی حد تک امکان میں نہ آئے

جب ہم یہ جانتے ہیں، کیسے گزر رہی ہے
میں تجھ کو کیوں بتاؤں، تو مجھ کو کیوں بتائے

سوداگر اصل وہ ہے شہروں میں بیچنے کو
خوشیاں بھی ساتھ لائے اور غم بھی ساتھ لائے

بازار میں رکے نہ کبھی زر کی سرکولیشن
یارب دکان خالی کوئی نظر نہ آئے

فٹ پاتھ ہی نہیں ہے سوؤں تو کیسے سوؤں؟
اس شہرِ اجنبی میں کوئی نہیں سرائے!

مشکل سے ہو رہا ہے ساجد مرا گزارہ
کوئی کرائے پر ہی میری زندگی چڑھائے

بہتر تو یہ ہے بھائی، خود اپنے کام آؤ
تم میرے کیسے ہو گے، تم تو ہوئے پرائے

میں بھوک لکھ رہا ہوں، تم عشق لکھ رہے ہو
وہ قحط ہے کہ کھاتی مائیں ہیں اپنے جائے

○

اہلِ نظر کے واسطے، عِلم کا باب ہو گیا
میں نے لکھا جو ایک حرف، ایک کتاب ہو گیا

غارِ ادب میں جب کبھی، اُتری ہے مجھ پہ وحیٔ شعر
قلب میں خون بھر گیا، ذہن گُلاب ہو گیا

مُنہ سے نکل گئی جو بات، ایک حدیث ہو گئی
جس کو ادب کے ضمن میں، پڑھنا ثواب ہو گیا

میری شکست و ریخت کا، مجھ سے سُنو نہ ماجرا
میرے ہی ہاتھ سے میرا، خانہ خراب ہو گیا

بیٹھے بٹھائے آج پھر، یاد کسی کی آ گئی!
سوہنی اُمید بن گئی، اشک چناب ہو گیا

حد سے گزر گیا ہے کون، شوقِ فلک نمائی میں
اہلِ زمیں کے واسطے، کون عذاب ہو گیا؟

اب تو زمیں سے تا فلک، پھیلے ہیں جال جنگ کے
امن کی فاختاؤں کا، اُڑنا عذاب ہو گیا

سویرا ص 257 شمارہ 52 - 50 مئی 1976ء

○

اُس آئینے میں دیکھنا، حیرت بھی آئے گی
اک روز مجھ پہ اُس کی طبیعت بھی آئے گی

قدغن لگا نہ اشکوں پہ، یادوں کے شہر میں
ہو گا اگر تماشا، تو خلقت بھی آئے گی

میں آئینہ بنوں گا، تو پتھر اُٹھائے گا
اک دن کھُلی سڑک پہ، یہ نوبت بھی آئے گی

موسم اگر ہے سرد' تو پھر آگ تاپ لے
چمکے گی آنکھ' خوں میں حرارت بھی آئے گی

کچھ دیر اور شاخ پہ رہنے دے، صبر کر
پکنے دے پھل کو، کھانے میں لذّت بھی آئے گی

آنکھیں ہیں تیرے پاس تو پھر سطحِ آب پر
گہرائی سے اُبھر کے عبارت بھی آئے گی

نکلیں چراغ ہاتھ میں لے کر گھروں سے لوگ
سورج کی رہ میں منزلِ ظُلمت بھی آئے گی

یہ جانتا تو کاٹتا ساجدؔ نہ سائے کو
تلوار پر لہو کی تمازت بھی آئے گی

فنون ص 200 شمارہ 12 نومبر' دسمبر 1969ء

○

صداقت کیا بُرائی سے بھی مُنہ موڑا نہیں ہم نے
جسے اپنا کیا اس کو کبھی چھوڑا نہیں ہم نے

کبھی بھی اپنے گھر سے خوفِ تنہائی نہیں آتا
مقیّد ہو کے دیواروں سے سر پھوڑا نہیں ہم نے

وفاداری ہمارے مُلکِ دل کی شرطِ اوّل ہے
بغاوت جس نے بھی کی ہے اسے چھوڑا نہیں ہم نے

اگر یہ کام کر لیتے جہاں میں سرخرُو ہوتے
وہی نالاں ہیں ہم سے جن کا دل توڑا نہیں ہم نے

تعلّق ہو کسی سے یا وہ اپنا شیشۂ دل ہو
کہ جس کو توڑ ڈالا پھر اسے جوڑا نہیں ہم نے

پیادے موم کے چابک لئے تھے، اس لئے ساؔجد
بساطِ فن پہ دوڑایا کبھی گھوڑا نہیں ہم نے

○

خُدا کی دین ہیں اس کو شباب اور چراغ
وہ لے کے پھرتا ہے ہر سُو گلاب اور چراغ

مری زمیں کے مقدّر کی روشنی ہے الگ!
جلا رہا ہے یہاں، آفتاب اور چراغ

سحر کے وقت سفر پر روانہ ہوتے ہیں
وہ جن کی آنکھوں میں روشن ہیں خواب اور چراغ

جو لا چکے ہیں اُنہی پر ہوئی ہیں راہیں بند
کہاں سے لائے گا کوئی جناب اور چراغ ؟

میں اپنی روشنی بھی اور اپنی بارش بھی
مجھی میں جاگے ہیں ساجد سحاب اور چراغ

○

ترے شمار سے گھاؤ کہیں زیادہ ہیں
جگہ ہے تنگ، پہ دل میں مکیں زیادہ ہیں

اِسی لئے تو زرِ دل کہیں نہیں رکھا
امانت ایک ہے لیکن امیں زیادہ ہیں

بشر تلاش میں جائے پسِ فلک لیکن
خزانے آج بھی زیرِ زمیں زیادہ ہیں

شُمار ہو کے بھی، اپنا کوئی شُمار نہیں
ہمیں زمانے میں کم ہیں، ہمیں زیادہ ہیں

○

مجھے نہیں ہے کوئی وہم ، اپنے بارے میں
بھرو نہ حد سے زیادہ ہوا ، غُبارے میں

تماشا ختم ہوا ، دُھوپ کے مداری کا
سُنہری سانپ چُھپے ، شام کے پٹارے میں

جسے میں دیکھ چکا ، اُس کو لوگ کیوں دیکھیں
نہ چھوڑی کوئی بھی باقی کشش نظارے میں

وہ بولتا تھا مگر لب نہیں ہلاتا تھا
اشارہ کرتا تھا، جُنبش نہ تھی اشارے میں

تمام لوگ گھروں کی چھتوں پہ آ جائیں
بڑی کشش ہے، نئے چاند کے نظارے میں

ملے مجھے بھی اگر کوئی شام فرُصت کی
میں کیا ہوں؟ کون ہوں؟ سوچوں گا اپنے بارے میں

پُرانی سمت مُڑے گا نہ کوئی بھی ساجد
یہ عہدِ نو نہ بہے گا، قدیم دھارے میں

فنون ص 20 شمارہ ۲۔ 1 نومبر دسمبر 1969ء

○

لکھی برہنہ سوچ ، تو شُہرت بہت ہوئی !
لوگوں کو میرے فن سے محبت بہت ہوئی

جس کے لئے کیا تھا تماشا ، وہی نہ تھا
ہونے کو جمع شہر میں خَلقت بہت ہوئی

اب کے برس بھی تازہ اُجالوں کے ہاتھ سے
چسپاں فصیلِ وقت پہ ظُلمت بہت ہوئی

ہر ایک پھُول، درد کے موسم نے ڈس لیا
جذبوں کی فصل پھر سے اَکارت بہت ہوئی

یادوں نے ایک دم مرا گھیراؤ کر لیا!
کل رات شہرِ دل میں بغاوت بہت ہوئی

جس دَم ادب کی دار پہ کھینچا گیا مجھے
شرمندہ فیصلے پہ عدالت بہت ہوئی

میرے لہو میں ڈُوب کے، اعزاز پا لیا
ملکِ سُخن میں لفظ کی عزّت بہت ہوئی

میں میرؔ کی طرح نہ خُدائے سُخن بنا
ہونے کو یوں تو میری عبادت بہت ہوئی

ساجدؔ ادب میں اور کرنسی نہ تُو چلا
افراط کی شکار یہ جدّت بہت ہوئی

نقوش ص 257 جنوری 1979ء

پتہ کیسے
دُھوئیں
بتا پھُولوں
مرا کیا، مـ
مرے گھـ
اُداسی نـ

○

پتہ کیسے چلے دنیا کو، قصرِ دل کے جلنے کا؟
دُھوئیں کو راستہ ملتا نہیں، باہر نکلنے کا

بتا پھُولوں کی مَسند سے اُتر کے، تجھ پہ کیا گزری؟
مرا کیا، میں تو عادی ہو گیا کانٹوں پہ چلنے کا

مرے گھر سے زیادہ دُور صحرا بھی نہیں لیکن
اُداسی نام ہی لیتی نہیں باہر نکلنے کا

چڑھے گا زہر خُوشبو کا اُسے، آہستہ آہستہ
کبھی بُھگتے گا وہ خمیازہ پھُولوں کو مَسلنے کا

مسلسل جاگنے کے بعد، خواہش رُوٹھ جاتی ہے
چلن سیکھا ہے بچّے کی طرح اُس نے مچلنے کا

زرِ دل لے کے پہنچا تھا، متاعِ جاں بھی کھو بیٹھا
دیا اس نے نہ موقع بھی کفِ افسوس ملنے کا

خوشی سے کون کرتا ہے، غموں کی پرورش ساجدؔ
کسے ہے شوق لوگو! درد کے سانچے میں ڈھلنے کا

نقوش ص 258 جنوری 1979ء

○

میں بھوک پہنوں، میں بھوک اوڑھوں، میں بھوک دیکھوں، میں پیاس لکھوں
برہنہ جسموں کے واسطے میں خیال کاتوں، کپاس لکھوں

سِسک سِسک کر جو مَر رہے ہیں، میں ان میں شامل ہوں اور پھر بھی
کسی کے دل میں اُمید بوؤں، کسی آنکھوں میں آس لکھوں

لہو کے قطرے بدن کے طائر، ہر ایک خواہش ہے شاخ میری
کسی زباں میں مہک اُگاؤں، کسی کے لب پر مٹھاس لکھوں

تھمے جو بارش تو لوگ دیکھیں، چھتوں پہ چڑھ کر دھنک کا منظر
میں اپنے دل کو اُجاڑ پاؤں، تمام عالم اُداس لکھّوں

مرا سفر ہے سمندر ایسا، جدھر بھی جاؤں، بِپھر کے جاؤں
کہیں اُچھالوں میں موجِ وحشت، کہیں میں خوف و ہراس لکھّوں

سویرا ص 256 مئی 1976ء

در قفس
رہا ہوئے
یہ سانحہ
لہو سے
ہوئی جو ش
جلا الاؤ

ں پہ چڑھ کر دھنک کا منظر
، تمام عالم اُداس لکھوں

بھی جاؤں، بکھر کے جاؤں
تیں میں خوف و ہراس لکھوں

سویرا ص 256 مئی 1976ء

○

درِ قفس جو کھُلا، آسمان بھُول گئے
رہا ہوئے تو پرندے اُڑان بھُول گئے

یہ سانحہ بھی ہُوا تو، مری زمیں پہ ہوا
لہو سے فصل اُگانا کسان بھُول گئے

ہوئی جو شام، تو لوگوں سے بھر گئی چوپال
جلا الاؤ، تو ہم داستان بھُول گئے

سفر سے لُوٹ کے رکھا تھا گھر میں پہلا قدم
ہنسے جو پھُول سے بچّے تکان بھُول گئے

وہاں بھی جھُوٹ نہ بولا، جہاں ضرورت تھی
ہمیں پہ حرف، کہ حق کی زبان بھُول گئے

شکار گاہ میں ساجدؔ اُنہیں خیال آیا
وہ گھر سے تیر تو لائے، کمان بھُول گئے

ماہِ نو ص 64 دسمبر 1979ء

○

چلے تو رختِ سفر ہم نے بےدھڑک باندھا
زمین سر پہ رکھی، پاؤں میں فلک باندھا

لگا رہے ہیں گناہوں کا ہم حساب کتاب
اسے ہی کھول رہے ہیں، جو آج تک باندھا

کیا ہے درد کی لذّت سے آشنا دل کو
جو زخم خشک ہوئے ان پہ ہی نمک باندھا

ہجوم میں کوئی انگلی اٹھی نہ اپنے خلاف
جب اس نے جھوٹ کا طومار بے جھجک باندھا؟

○

یارب نہ کبھی میرے اُصولوں میں لچک آئے
جب جنگ چھڑے، تیری ہی جانب سے کُمک آئے

مُرجھائے کوئی پھُول' نہ ویراں ہو کوئی شاخ
گلزارِ صداقت سے پرندوں کی چہک آئے

شب گرد ہوں ایسا کہ جسے راہ دکھانے
نکلے نہ اگر چاند تو جُگنو کی چمک آئے

خوش بخت ہوں ایسا کہ جو پھُولوں کی طلب ہو
نیّت کو مری دیکھ کے خود شاخ لپک آئے

بیٹھے تو پُکار اُٹھے، کڑی دُھوپ بھَلی تھی
جو سائے کی خاطر تری دیوار تلک آئے

ماہِ نو ص 74 شمارہ 1 اپریل 1977ء

○

طُلوعِ صُبح کا منظر، سفر میں دیکھتا ہے وہ
غروبِ مہر لیکن اپنے گھر میں دیکھتا ہے وہ

بڑا خوش بخت ہے، پہلی اذاں سنتا ہے برسوں سے
پرندوں کو ثنا کرتے شجر میں دیکھتا ہے وہ

کبھی صحرا' کبھی دریا سے اپنا رزق پاتا ہے
ہر اک شے اپنی محنت کے اثر میں دیکھتا ہے وہ

اُسے بستی میں کہتے ہیں سبھی، اُجلی نظر والا
بُرائی چھوڑ کر ، خوبی بشر میں دیکھتا ہے وہ

ستارے کی طرح آنکھیں چمک اُٹھتی ہیں پھر اُسکی
کسی کے نقشِ پا جب رہ گُذر میں دیکھتا ہے وہ

خدا جانے کئی دن سے اسے کیا ہو گیا ساجد
نگر میں سوچتا ہے وہ' کھنڈر میں دیکھتا ہے وہ

روزنامہ نوائے وقت

○

دیوار و در کے ہاتھ سے، رُسوائی چھن گئی!
رونق تھی جس سے گھر میں، وہ تنہائی چھن گئی

کچھ لوگ لے اُڑے ہیں مری انفرادیت
شہرت ملی تھی جس سے وہ رُسوائی چھن گئی

موجیں اُچھل کے شور مچائیں کرن کی سمت
دریا دُہائی دے کہ مری کائی چھن گئی

اس پر بھی سرد و گرم کا ہونے لگا اثر
حیرت ہے، اس گھڑے سے بھی چکنائی چھن گئی

تھا وُسعتِ خلا کو اُسے دیکھنے کا شوق
آتے ہی سطحِ آب پہ گہرائی چھن گئی

جس میں بھرا تھا زہر، وہ سورج رفو کیا
یہ غم نہیں کہ آنکھ سے بینائی چھن گئی

کچھ دائروں کی قید سے نُقطے نکل گئے
سطحیں سپاٹ ہوگئیں' گولائی چھن گئی

سستے ہوئے اب اتنے کہ شُہرت کرائیں کبش
کچھ لوگ جن کے نام کی مہنگائی چھن گئی

کیا لُطف اوڑھنے میں پُرانے لحاف کو
اُس کے بدن کی رُوئی سے گرمائی چھن گئی

فنون ص 166 دسمبر 1973ء

○

ہائے رہے حالات ، اک مہمان لوٹانا پڑا
"میں نہیں گھر میں" یہ بچّے سے کہلوانا پڑا

میں نے اپنی بےبسی پر خود لگائے قہقہے
آنسوؤں کی بارشوں میں جسم جُھلسانا پڑا

چھینا جھپٹی کی مزاروں پر ، تبرّک کے لئے
بُھوک جب حد سے بڑھی، خیرات کا کھانا پڑا

جانور کی کھال پہنی اور چلا پنجوں کے بل
بن گیا بہروپیا، بازار میں آنا پڑا

دوسروں کے جُرم، اپنے نام پر لکھوا لئے
دوستو! روٹی کی خاطر جیل بھی جانا پڑا

میں یگانہ تھا، نہ غالب سے تھی میری دشمنی
لوگ جب حد سے بڑھے، اس سطح پر آنا پڑا

کیا کروں مجبور تھا، حق چھیننے کے واسطے
غیر اخلاقی رویّہ مجھ کو اپنانا پڑا

سستی شُہرت کے لئے، ساجد اُچھالیں پگڑیاں
خوش ہوا محفل میں، تنہائی میں پچھتانا پڑا

فنون ص 162 شمارہ 6۔ 1 نومبر، دسمبر 1972ء

سفر اور
کہ جـ
ترے
یہ جسـ
در و
کبھی

پہنی اور چلا پنجوں کے بل
بازار میں آنا پڑا

اپنے نام پر لکھوا لئے
خاطر جیل بھی جانا پڑا

سے تھی میری دشمنی
بڑھے، اس سطح پر آنا پڑا

حق چھیننے کے واسطے
رویّہ مجھ کو اپنانا پڑا

ساجد اُچھالیں پگڑیاں
میں تنہائی میں پچھتانا پڑا

شمارہ 6- نومبر، دسمبر 1972ء

○

سفر اور خواب کی آنکھوں میں اک تصویر بنتے ہیں
کہ جتنے راستے ہیں پاؤں کی زنجیر بنتے ہیں

ترے عکسوں پہ گویا آج بھی ہے دسترس میری
یہ جب شیشے میں آتے ہیں مری تحریر بنتے ہیں

در و دیوار کی بُنیاد کس بُنیاد پر رکھوں؟
کبھی اینٹیں، کبھی مہنگے یہاں شہتیر بنتے ہیں

مرے اعمال ہیں یا موسموں کا اک تغیّر ہے!
کبھی تخریب بنتے ہیں، کبھی تعمیر بنتے ہیں

میں جس بستی میں بستا ہوں وہاں کے لوگ اے لوگو
وہی دوزخ، وہی میرے لئے کشمیر بنتے ہیں

مرُید ان کے نہیں لیکن مزار ان کی وارثت ہیں
سجا کر پگڑیاں جو اپنے سر پر پیر بنتے ہیں

میں اپنے ناخنوں کو کاٹ کر ساجد کہاں جاؤں ؟
نہ یہ تدبیر بنتے ہیں، نہ یہ تقدیر بنتے ہیں

ہیں یہ موسموں کا اک تغیّر ہے !
بنتے ہیں، کبھی تعمیر بنتے ہیں

میں بستا ہوں وہاں کے لوگ اے لوگو
وہی میرے لئے کشمیر بنتے ہیں

نہیں لیکن مزار ان کی وارثت ہیں
جو اپنے سر پر رپیر بنتے ہیں

وں کو کاٹ کر ساجد کہاں جاؤں ؟
بنتے ہیں، نہ یہ تقدیر بنتے ہیں

○

ہونا ہے کسی شے کا نہ ہونے کے برابر
پانا بھی یہاں خود کو ہے کھونے کے برابر

اُس شخص نے تو آج مجھے توڑ دیا ہے
میں جس کو سمجھتا تھا کھلونے کے برابر

اس شہر میں محنت کا ثمر اور ہی کچھ ہے
پانی ہے وہاں دودھ بلونے کے برابر

انساں کی قیمت تو کوئی خاص نہیں ہے
مٹّی کا یہاں بھاؤ ہے سونے کے برابر

اے پوچھنے والو' مری حالت کا نہ پوچھو
ہنسنے کے برابر ہے نہ رونے کے برابر

کیا خوفِ طلاطم ہو' سمندر تو نہیں ہے
آنسو ہے فقط آنکھ بھگونے کے برابر

گو عشق نہیں منع مگر آج بھی ساجدؔ
یہ کام ہے کہسار کے ڈھونے کے برابر

ت تو کوئی خاص نہیں ہے
س بھاؤ ہے سونے کے برابر

وا ہو مری حالت کا نہ پوچھو
بر ہے نہ رونے کے برابر

ختم ہو، سمندر تو نہیں ہے
ھ آنکھ بھگونے کے برابر

ں منع مگر آج بھی ساجد
بستر کے ڈھونے کے برابر

○

مُوند کر آنکھیں، تلاشِ بحر و بَر کرنے لگے
لوگ اپنی ذات کے اندر سفر کرنے لگے

مانجھیوں کے گیت سُن کر، آ گیا دریا کو جوش
ساحلوں پہ رقص تیزی سے بھنور کرنے لگے

بڑھ گیا ہے اس قدر اب سرخُرو ہونے کا شوق
لوگ اپنے خون سے جسموں کو تر کرنے لگے

باندھ دے شاخوں سے تو، مٹی کے پھل ' کاغذ کے پھول
یہ تقاضا راہ میں اُجڑے شجر کرنے لگے

گاؤں میں کچّے گھروں کی قیمتیں بڑھنے لگیں
شہر سے نقلِ مکانی اہلِ زر کرنے لگے

جیسے ہر چہرے کی آنکھیں، سر کے پیچھے آ لگیں
سب کے سب اُلٹے ہی قدموں سے سفر کرنے لگے

اب پڑھے لکھے بھی ساجدؔ آ کے بیکاری سے تنگ
شب کو دیواروں پہ چسپاں پوسٹر کرنے لگے

فنون ص 44 اپریل 1971ء

○

جو تیری بات میں ہوتے اگر مُخِل بھی ہم
ذرا سی دیر میں کرتے تجھے خجل بھی ہم

ہماری محنتیں ہر کھیت کا وقار بنیں
کہ حسنِ فصل بھی ہم، حسنِ آب و گِل بھی ہم

ہمارے پاس کوئی تاج ہے نہ تخت مگر
امیرِ ذہن بھی ہم ہیں، امیرِ دل بھی ہم

وہ تیرا چہرہ اور آنکھیں پہن کے آئے گا
تری بدل سے کریں گے تجھے خجل بھی ہم

لڑے تھے امن کی خاطر مگر صلہ یہ ملا
شہید ہو کے بھی کہلائے سنگدل بھی ہم

اُٹھائے سے نہ اُٹھے گی تو لوگ روئیں گے
رکھیں گے سینے پہ پتھر کی ایسی سِل بھی ہم

ہمارے پاس ہے فہرستِ ظالم و مظلوم
کہ سخت جان بھی ہم ہیں تو موم دل بھی ہم

اسے خبر بھی نہیں جس کے واسطے ساجد
نثار کرنے کو آئے تھے جان و دل بھی ہم

5 مارچ 1987ء

...ور ...نکھیں پہن کے آئے گا
...ے ...ریں گے تجھے خجل بھی ہم

...ن ی خاطر مگر صلہ یہ ملا
...ے ...جی ...ہلائے سنگدل بھی ہم

...نہ ...ٹھے گی تو لوگ روئیں گے
...سینے پہ پتھر کی ایسی سِل بھی ہم

...ں ہے فہرستِ ظالم و مظلوم
...ں ...جی ہم ہیں تو موم دل بھی ہم

...ں نہیں جس کے واسطے ساجد
...و ...ئے تھے جان و دل بھی ہم

5 مارچ 1987ء

○

عارض کی آنچ، گرمیٔ لب اُس سے چھین لے
خُوشبو، مٹھاس، ذائقہ سب اس سے چھین لے

اک صُبح، اس کے تازہ بدن کی شَفق چُرا
اک شام، روشنی کا سبب اس سے چھین لے

وہ سنگ ہے، تو اس میں سے مرمر نکال دے
اور پھُول ہے، تو رنگِ طرب اس سے چھین لے

تتلی کے پاس چھوڑ نہ رنگوں کی دُھوپ چھاؤں
جتنا بھی اسکا حُسن ہے سب اس سے چھین لے

سادہ وَرق پہ لَمس کی تصویر بھی بنا!
پھر اسکے بعد حُسنِ طلب اس سے چھین لے

وہ دائرے میں رقص کے ہو جائے مُنجمد
پہلی نظر میں موجِ طرب اس سے چھین لے

ساجد زرِ بدن پہ اسے ناز ہے بہت
گاہک نہ بن، لگا کے نقب اس سے چھین لے

اوراق ص 143 ستمبر'اکتوبر 1975ء

○

حاصل کرو مرے لئے نفرت ، کرائے پر
لے آؤ سارے شہر کی خَلقت کرائے پر

صاحب اگر ہیں آپ، تو سب آپ کے غلام
ہر شے ملے گی حسبِ ضرورت کرائے پر

اِس نفرتوں کے شہر میں، کچھ دن کے واسطے
جُھوٹی سہی' ملے تو محبت کرائے پر

ز نہ رنگوں کی دُھوپ چھاؤں
ے سب اس سے چھین لے

س کی تصویر بھی بنا!
ن سب اس سے چھین لے

نفس کے ہو جائے مُنجمد
ق سب اس سے چھین لے

پ اسے ناز ہے بہت
ے نسب اس سے چھین لے

رق ص 143 ستمبر/اکتوبر 1975ء

تُو ہانپ جائے اور مری سانس پھُول جائے
دے ایسے مجھ کو پیار کی شدّت کرائے پر

جسموں کی منڈیوں میں سبھی کچھ ملے گا دوست
تنہائی، قرُب، لمس و حرارت کرائے پر

کچھ برف برف لوگ پگھلنے کے واسطے
سورج سے چاہتے ہیں تمازت کرائے پر

ظالم معاشرے کی صفائی میں، کچھ نہ کہہ
قاتل کے حق میں دے نہ شہادت کرائے پر

بھر جائیگی زمین کی صورت فضا بھی کل
اُٹھ جائے گی فضا کی بھی وُسعت کرائے پر

جائز ہے کاروبار کی خاطر یہاں پہ سب
چندہ کفن کے واسطے، میّت کرائے پر

پیسہ ہے تیرے پاس، تو کچھ نام بھی کما
لے آ کسی غریب سے شہرت کرائے پر

فنون ص 82 شمارہ 6-5 اپریل، مئی 1972ء

کیا ملا اقب
اب گزر اوق
کھول لے بز
وقت ہے پیسہ
تُو نے جو کہ
پیٹ کا دوزخ

○

کیا ملا اقبال ساجد جدّتِ فن بیچ کر؟
اب گزر اوقات کر، دانتوں کا منجن بیچ کر

کھول لے بازار میں، چہرے سجانے کی دُکان
وقت ہے پیسہ کما لے، رنگ و روغن بیچ کر

تُو نے جو لکھا ہے، اُسکو کُوڑا کرکٹ ہی سمجھ
پیٹ کا دوزخ بجُھا سوچوں کا ایندھن بیچ کر

اور مری سانس پھُول جائے
کی شدّت کرائے پر

میں سبھی کچھ ملے گا دوست
و حرارت کرائے پر

پگھلنے کے واسطے
ہیں تمازت کرائے پر

میں، کچھ نہ کہہ
نہ شہادت کرائے پر

صورت فضا بھی کل
بھی وُسعت کرائے پر

خاطر یہاں پہ سب
میّت کرائے پر

تو کچھ نام بھی کما
سے شُہرت کرائے پر

5 اپریل، مئی 1972ء

میں کوئی "یوسف" نہیں جو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں
کچھ نہ پائے گا، مجھے اے میرے دشمن بیچ کر

مُفت میں تیرے دُکھوں کا کون گاہک بن گیا؟
کس کے ہاتھوں تُو چلا آیا ہے اُلجھن بیچ کر؟

دوسروں کو اپنی ویرانی کا کیوں الزام دوں؟
آپ ہی صحرا خریدا اُس نے گُلشن بیچ کر

میرا پیراہن پہن کر، لوگ شُہرت پا گئے
میں تو ننگا ہو گیا، اپنا نیا پَن بیچ کر

عزّتیں اُن کو ملیں، جن کی کوئی عزّت نہ تھی
ہم کہ رُسوائی کا باعث ہو گئے، فن بیچ کر

فنون ص 57 شمارہ 3 اگست 1971ء

نہیں جو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں
مجھے اے میرے دشمن بیچ کر

ذہنوں کا کون گاہک بن گیا؟
تو چلا آیا ہے اُلجھن بیچ کر؟

ویرانی کا کیوں الزام دوں؟
خریدا اُس نے گُلشن بیچ کر

چمن کر، لوگ شُہرت پا گئے
ہو گیے، اپنا نیا پَن بیچ کر

میں جن کی کوئی عزّت نہ تھی
کا باعث ہو گئے، فن بیچ کر

فنون ص 57 شمارہ 3 اگست 1971ء

○

مِلا تو حادثہ کچھ ایسا دلخراش ہوا
وہ ٹُوٹ پھُوٹ کے بکھرا، مَیں پاش پاش ہوا

تمام عمر ہی اپنے خلاف سازش کی
وہ احتیاط کی، خود پر نہ راز فاش ہوا

ستم تو یہ ہے، وہ فرہادِ وقت ہے، جس نے
نہ جُوئے شیر نکالی' نہ بُت تراش ہوا

یہی تو دُکھ ہے، بُرائی بھی قاعدے سے نہ کی
نہ میں شریف رہا اور نہ بدمعاش ہوا

ہو ایک بار کا رونا، تو روؤں بھی دل کو
یہ آئنہ تو کئی بار پاش پاش ہوا

بَلا کا حبس تھا ساؔجد، ہوا کی بستی میں
چلی جو سانس کی آری، میں قاش قاش ہوا

"اپنی زمین"

...بزاری بھی قاعدے سے نہ کی
... رہا اور نہ بدمعاش ہوا

... رونا تو رووں بھی دل کو
... کئی بار پاش پاش ہوا

... ساجد، ہوا کی بستی میں
... آری، میں قاش قاش ہوا

"اپنی زمین"

○

پتہ ہوا نہیں تبدیل آج تک اپنا
زمیں پہ رہ کے بھی معیار ہے فلک اپنا

کہ میرے نام پہ اخبار چھاپتے ہیں اُسے
وہ اشتہار بنانے لگا ہے شک اپنا

گواہ اس کے دریچے کہ اُس کی آنکھوں سے
نشان خود ہی بتانے لگی چمک اپنا

شکایت اُن سے نہیں، کھا کے جو مُکرتے ہیں
کہ اپنا ہو کے بھی لگتا نہیں نمک اپنا

سبھی خریدیں' دوپٹے کی آبرُو نہ گنوا
ہے خَلق جمع ترے در پہ سر بھی ڈھک اپنا

خود اپنے ہاتھ سے دھوئیں خرابیاں ساجدؔ
محاسبہ بھی کیا ہے بِلک بِلک اپنا

ے نہیں، کھا کے جو مکرتے ہیں
ے بھی لگتا نہیں نمک اپنا

دوپٹے کی آبرو نہ گنوا
ترے در پہ سر بھی ڈھک اپنا

تجھ سے دھوئیں خرابیاں ساجد
یہ ہے بلک بلک اپنا

○

نمو کی خواہشیں رکھ کر سحاب کاشت کرو
پھر اس کے بعد نیا آفتاب کاشت کرو

تمہارا اپنا عمل خود تمہارے بس میں ہے
ثواب کاشت کرو یا عذاب کاشت کرو

خمیرِ خاک کسی روز رنگ لائے گا
زمینِ سنگ پہ ہر دم گلاب کاشت کرو

کہیں تمہارے عمل پر نہ حرف آ جائے
پکی ہے فصل اسے زیرِ آب کاشت کرو

سرائے دشت سے آنکھیں چُرا رہے ہو کیوں ؟
تمہیں یہ کس نے کہا تھا سراب کاشت کرو؟

ملے گا رزق اِنہی سے خُدا کی نعمت ہیں
سفر اُگاؤ اِن آنکھوں میں، خواب کاشت کرو

تُلے ہوئے ہو جو تاریخ مسخ کرنے پر
سخن کے باب میں کوئی تو باب کاشت کرو

عکس پر نہ حرف آ جائے
عکس اسے زیرِ آب کاشت کرو

سے آنکھیں چُرا رہے ہو کیوں ؟
نے کہا تھا سراب کاشت کرو؟

انہی سے خُدا کی نعمت ہیں
آنکھوں میں، خواب کاشت کرو

ہو جو تاریخ مسخ کرنے پر
میں کوئی تو باب کاشت کرو

○

رنگ برنگے نقشے دیکھ
آوازوں کے چہرے دیکھ

دیکھ خلاء میں پچھلے عکس
پچھلی دُنیا والے دیکھ

اپنے اَب و جَد پہچان
اُن کے چہرے مُہرے دیکھ

رسموں کے آئینے میں
تہذیبوں کے نقشے دیکھ

گزرے وقتوں کی تحریر
لوحِ خُلد پہ پڑھ کے دیکھ

اگست 1985ء

سے آئینے میں
سے نقشے دیکھ

وقتوں کی تحریر
نمد پہ پڑھ کے دیکھ

اگست 1985ء

○

جو بحر کہ ساکن ہو، اسے بحرِ رواں لکھ
اک آدھ غزل وزن سے باہر بھی یہاں لکھ

گُم کر دیا لوگوں نے اگر حُسنِ لطافت
رستے میں پڑے پھُول کو بھی سنگِ گراں لکھ

یہ کام کسی اور ہی موسم پہ اُٹھا رکھ
اس وقت غزل میں نہ معانی کا جہاں لکھ

ق

جب دوسرے ساحل پہ وہ پڑھتا ہے ترا عشق
اِس شام ہی پیغام سرِ آب رواں لکھ

یہ پوچھ کہ کتنا ہے محبت کا کرایہ
اور کتنا کُشادہ ہے ترے دل کا مکاں لکھ

ظاہر نہ ترے گھر کے مسائل ہوں کسی پر
ہو جنگ کا عالم، تو اسے امن واماں لکھ

چل جائے گی جو رسم چلائے گا، سُخن میں
فیشن کےلئے کوئی ڈیزائن بھی یہاں لکھ

حاکم ہے تو دے حکمِ شکار آج سرِدشت
مفلوُج کے ہاتھوں کےلئے تیروکماں لکھ

لکھنے میں ادا فرضِ تعلّی بھی ہو ساجد
دُنیا کے ادب میں ترا سکّہ ہے رواں لکھ

جون 1987ء گلاب دیوی ہسپتال لاہور

پہ وہ پڑھتا ہے ترا عشق
پیغام سرِ آب رواں لکھ

ہے محبت کا کرایہ
ترے دل کا مکاں لکھ

کے مسائل ہوں کسی پر
تو اسے امن واماں لکھ

رسم چلائے گا، سُخن میں
بھی یہاں لکھ

حَیِم شکار آج سرِدشت
کے لئے تیروکماں لکھ

تعلّی بھی ہو ساجد
ترا سکّہ ہے رواں لکھ

جون 1987ء گلاب دیوی ہسپتال لاہور

○

یوں ذہن سے اَفکار کا پیکر نکلے
جس طرح شعِ صبح، اُفق پر نکلے

دوشیزۂ تخلیق سرراہِ ادب
پوشاکِ زرِ علم پہن کر نکلے

اے کوزہ گرِ لفظ! مزہ تو جب ہے
ہر لفظ سے معنی کا سمندر نکلے

سوچوں کی تب‌وتاب نہ دیکھی جائے
سورج ہے کہ پرچھائیں پہن کر نکلے

اب کے تو ہر اک طفل کے ہاتھوں سے اُڑے
مٹی کے پرندوں کو بڑے پَر نکلے

ہر پیٹ میں اک بھُوک کی سنگین لگی
پھر فاقہ زدہ شہر میں، خنجر نکلے

سینچا تھا درختوں کو لہو سے لیکن
پھولوں کی جگہ شاخ پہ پتھر نکلے

اس طرح لکھے بحرِ رباعی میں غزل
ساجد کی طرح کوئی سخن ور نکلے

"نیرنگِ خیال" فروری، مارچ 1976ء

...ب نہ دیکھی جائے
...پرچھائیں پہن کر نکلے

...کے ہاتھوں سے اُڑے
...کو بڑے پُر نکلے

...کی سنگین لگی
...میں، خنجر نکلے

...کو لہو سے لیکن
...شاخ پہ پتھر نکلے

...رباعی میں غزل
...کوئی سخن ور نکلے

...'' فروری، مارچ 1976ء

○

یہی ہے آرزو بس ایک بار اپنا ہو
بہادروں کی صفوں میں شمار اپنا ہو

خدا کرے نہ کسی شخص کا اسیر مجھے
میں جس میں قید بھی کاٹوں حصار اپنا ہو

میں جنگ امن کو جیتوں، ہجوم سے بھی بچوں
مرے گلے میں پڑے جو بھی ہار، اپنا ہو

تری سوسائٹی میں کوئی تیرا یار نہیں
تجھے جو یار بھی ہونا ہے، یار اپنا ہو

خدا کہیں نہ کہیں تو سکوں ملے مجھ کو
چمن نہیں تو کوئی خارزار، اپنا ہو

خدا کرے کہ پرندں کی بددعا لگ جائے
شکاری اپنے ہی ہاتھوں شکار اپنا ہو

شگاف سینکڑوں ہیں اور بادباں بھی نہیں
سفینہ کیسے سمندر کے پار اپنا ہو

اکیلے پن کا سفر راس آ گیا ساجدؔ
میں چاہتا نہیں ساتھی غُبار اپنا ہو

20 ر فروری 1987ء سروسز ہسپتال لاہور

ں کوئی تیرا یار نہیں
ی ہونا ہے، یار اپنا ہو

ہیں تو سکوں ملے مجھ کو
وئی خارزار، اپنا ہو

پرندوں کی بددعا لگ جائے
ی ہاتھوں شکار اپنا ہو

ہیں اور بادباں بھی نہیں
سمندر کے پار اپنا ہو

پاس آ گیا ساجد
یں ساتھی غُبار اپنا ہو

2 فروری 1987ء سروسز ہسپتال لاہور

○

گویا دیارِ زیست میں بے نام و ننگ تھا
میں اپنی خواہشات کے ہاتھوں ہی تنگ تھا

اک دوسرے کے ساتھ گزرتی تھی زندگی
وہ میری آرزو تھا، میں اس کی امنگ تھا

اس کا پتہ چلا مجھے سیرِ چمن کے بعد
جو پھول تھا چمن میں، حقیقت میں سنگ تھا

اس کو بھی ہم نے کب کا فراموش کر دیا
اسلاف نے سکھایا جو جینے کا ڈھنگ تھا

اک تاجدار کو نہ ملا وہ سر محل
جیسے سکونِ قلب کا مالک ملنگ تھا

وہ بھی بہت تھکا تھا' محبت کی راہ میں
احمدؔ مرا بھی ٹوٹا ہوا انگ انگ تھا

سب کا فراموش کر دیا
جو جینے کا ڈھنگ تھا

نہ ملا وہ سر محل
کا مالک ملنگ تھا

تھے، محبت کی راہ میں
ہوا انگ تھا

○

جگر کا خون بھی اور آنکھ کی لالی بھی دیتے ہیں!
جسے ہم پیار کرتے ہیں، اُسے گالی بھی دیتے ہیں

جھکاتے سر ہیں لیکن سربلندی کے لئے ہم کو
شجر جو ہیں وہ پھولوں سے لدی ڈالی بھی دیتے ہیں

ہم اپنے ہاتھ سے رکھ دیں، خود اپنا سر قلم کر کے
اسی خاطر ہمیں سونے کی وہ تھالی بھی دیتے ہیں

جو شاہِ وقت ہیں اس واسطے اپنی رعایا کو
وہ بدحالی بھی دیتے ہیں، وہ خوشحالی بھی دیتے ہیں

نظر آتی ہے جن میں قوّتِ نشوونما ساجد
انہی پودوں کو اپنا خون خود مالی بھی دیتے ہیں

یں ِس واسطے اپنی رعایا کو
یتے ہیں، وہ خوشحالی بھی دیتے ہیں

جن میں قوّتِ نشوونما ساجد
نے خون خود مالی بھی دیتے ہیں

○

چُلّو میں ہم نے صبرِ خضر رکھ لیا
اپنی جھولی میں رختِ سفر رکھ لیا

ہر طرف گھومتا ہوں مسائل لئے
نام کمرے کا یوں رہگزر رکھ لیا

ایک لمحے میں ساری کشش چھین لی
اس نے گروی بھی حسنِ نظر رکھ لیا

تھا سفر میں ضروری تو پھر دوش پر
اس نے دیوار اور میں نے در رکھ لیا

مور ناچا جو وقتِ سحر ذہن میں
میں نے قرآن میں اس کا پر رکھ لیا

آج پوری یہ کس کی تمنا ہوئی؟
کس نے بنیاد میں آبِ زر رکھ لیا

مجھ کو جنگل میں ساجدؔ بشارت ہوئی
کاٹ کر میں نے گھر میں شجر رکھ لیا

7ر جنوری
1986ء

ں ضروری تو پھر دوش پر
ور میں نے در رکھ لیا

جو وقتِ سحر ذہن میں
ن میں اس کا پر رکھ لیا

یہ کس کی تمنا ہوئی؟
نیں میں آبِ زر رکھ لیا

میں ساجد بشارت ہوئی
میں نے گھر میں شجر رکھ لیا

7 رجنوری
1986ء

○

میرے رستوں کی رکاوٹ بن کے مشکل ہو گئے
گویا ناداں اپنی ہی راہوں میں حائل ہو گئے

سامنے جب آئے تو پھر گفتگو ایسی ہوئی
دیکھتے ہی دیکھتے وہ میرے قائل ہو گئے

واسطہ تھا اس لئے ایک دوسرے کی ذات سے
ان میں شامل میں ہوا' وہ مجھ میں شامل ہو گئے

اس سے بڑھ کے اور کیا کرتے یہاں دریا دلی
وہ سمندر بن گئے تو ہم بھی ساحل ہو گئے

ہم سزا دیں گے اسے ہم بادشاہِ وقت ہیں
ہم کو یہ جس نے کہا ہم فن میں کامل ہو گئے

اس نے مجھ کو کچھ دیا، اور میں نے اس کو کچھ دیا
ایک ہی لمحے میں طے سارے مسائل ہو گئے

یعنی نیت تھی سفر کی تو سفر کے درمیان
خود بخود احمد حسن آساں مراحل ہو گئے

ے اور کیا کرتے یہاں دریا دلی
گئے تو ہم بھی ساحل ہو گئے

ے اسے ہم بادشاہِ وقت ہیں
نے کہا ہم فن میں کامل ہو گئے

چھ دیا اور میں نے اس کو کچھ دیا
میں تھے سارے مسائل ہو گئے

سفر کی تو سفر کے درمیان
حسن آساں مراحل ہو گئے

○

ہر ایک سمت لاشوں کے انبار دیکھ کر
دل خوں ہوا ہے صبح کا اخبار دیکھ کر

ویرانیوں کے رقص سے پہچان ہو گئی
گھبرائے لوگ شہر کا بازار دیکھ کر

آنکھوں سے اپنی خون کے آنسو ٹپک پڑے
دیوار و در پہ ظلم کے شہکار دیکھ کر

امن و اماں کے بارے میں کیا گفتگو ہوئی،
آئے ہو تم تو شاہ کا دربار دیکھ کر

پھوٹیں گے میرے پاؤں کے چھالے بڑھے گا لطف
"جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر"

میرا یقیں ہے روئے گا فاروق وہ مجھے
جو ہنس رہا ہے مجھ کو سرِ دار دیکھ کر

ے بارے میں کیا گفتگو ہوئی،
تو شاہ کا دربار دیکھ کر

ے پاؤں کے چھالے بڑھے گا لطف
ے راہ کو پُرخار دیکھ کر"

ے روئے گا فاروق وہ مجھے
ب مجھ کو سرِ دار دیکھ کر

○

آؤ چلیں ساحل پر دیکھیں ہم بھی دلکش منظر
یاری پکی کر بیٹھے ہیں بارش، دھوپ، سمندر

سب انسان مداری ٹھہرے، اس دنیا کے میلے میں
کوئی نچائے کٹھ پُتلی اور کوئی نچائے بندر

پھول سے چہرے آنکھیں لیکن اک پل میں مرجھائے
میں بھی کم شاداب تھا اس دن وہ بھی تھا کچھ بنجر

سوچوں کی افراتفری میں کون کسے سمجھائے؟
جانے کہاں لے جائے تم کو آنکھوں کا یہ ڈر

وہ بھی تنہا تھا بستی میں، اُس کو اِتنی فرصت تھی
ریت کی دیواروں پر ساجدؔ اس نے پھینکے خنجر

ذی میں کون کسے سمجھائے ؟
جئے تم کو آنکھوں کا یہ ڈر

تی میں، اُس کو اِتنی فرصت تھی
ں پہ ساجد اس نے پھینکے خنجر

○

یکطرفہ میرے گھر میں اک جنگ ہو رہی تھی
دیکھا تو گھر میں ماں کی تصویر رو رہی تھی

کتنا عجیب نکلا بعدِ سفر کا منظر
دروازہ ہنس رہا تھا، دیوار رو رہی تھی

باہر ہوا کی زد پر پہنچی جو شمعِ خانہ
تو تھی بھڑک بھڑک کر ہلکان ہو رہی تھی

رُت جا رہی تھی جس دم پھولوں کو ساتھ لے کر
میری نہیں خود اپنی پہچان کھو رہی تھی

مجھ سے بچھڑ گئی کیوں اک موڑ کاٹنے پر
میرے سفر کی ساتھی ہر لمحہ جو رہی تھی

○

لباس اس کے بدن پر حسین ایسا تھا
پلک جھپکتے نہ تھے لوگ سین ایسا تھا

پڑی پھوار تو خُود ربچھ کے مجھ کو اوڑھ لیا
سمجھ گیا اشارہ ذہین ایسا تھا

اُمڈ پڑا تھا اسے شہر دیکھنے کے لئے
رُکا ہوا تھا ٹریفک حسین ایسا تھا

…س ہم پھولوں کو ساتھ لے کر
…پنی پہچان کھو رہی تھی

…یوں اک موڑ کاٹنے پر
…تھی ہر لمحہ جو رہی تھی

قطعہ

ملنے کا مرا اس سے ارادہ بھی نہیں ہے
سادہ ہے مگر اتنا وہ سادہ بھی نہیں ہے

مشہور ہے اُس شخص کی رنگین مزاجی
حالانکہ وہ دلدادۂ بادہ بھی نہیں ہے

قطعہ

ے ارادہ بھی نہیں ہے
تہ وہ سادہ بھی نہیں ہے

شخص کی رنگین مزاجی
رۂ بادہ بھی نہیں ہے

قطعہ

اک حدِ روشنی ہے مرا مقصدِ حیات
تاریک راستوں کے لئے ہم سفر بھی دے

تیری خبر تو ہے، تجھے میری خبر بھی ہے
اِس شہر کے لئے کوئی آئینہ گر بھی دے

قطعہ

صاحبِ امکاں ہے، کیا امکان کے بس میں نہیں ؟
یہ غلط ہے کوئی شے انسان کے بس میں نہیں

موسموں کی قید سے آزاد ہے میرا گمان !
یہ کسی آندھی، کسی طوفان کے بس میں نہیں

○

زن کی ہے' زمیں کی ہے کہیں گھر کی ہوَس ہے
اس شہر میں ہر شخص کو ہی زر کی ہوَس ہے

ہر نہر کا سودا ہے سمندر سے زیادہ
دریا کی ہوس گویا سمندر کی ہوَس ہے

کہتا ہے کہ انسان فقط اس کو ہی پُوجے
تلقینِ عبادت بھی تو آذر کی ہوَس ہے

سب شاہ و گدا ایک مرض کے ہیں مقابل
دیوار کا لالچ ہے کہیں دَر کی ہوَس ہے

ہم لوگ کسی حال پر راضی نہیں ساجد
ہر وقت ہمیں صُورتِ بہتر کی ہوَس ہے

تین اشعار

ہر بار گلِ زخم کی پوشاک خریدی
دل نے کبھی پیراہن سادہ نہیں پہنا

مشروط رہائی پہ نہ تیار ہوئے رند
یہ طوق سر محفل بادہ نہیں پہنا

حیران بہت ہوں کہ مری آنکھ نے ساجد
اس عید پہ اشکوں کا لبادہ نہیں پہنا

دو شعر

سبزہ ہوں، زیر سنگ ہوں، نشوونما تو دیکھ
جوش نمو سے سنگ گرانی میں آئے گا

تو لاکھ اپنے نام کا کتبہ اٹھائے پھر
یہ لفظ کب لباس معانی میں آئے گا

دو شعر

سنگ ہوں، نشوونما تو دیکھ
سنگ گرانی میں آئے گا

کا کتبہ اٹھائے پھر
معانی میں آئے گا

قطعہ

آتا تو ہے بستی میں سمندر کی طرف سے
مسمار کسی گھر کو طلاطم نہیں کرتا

جنت میں فقط مجھ سے یہی پھل تو بچا تھا
انسان تھا کیوں خواہش گندم نہیں کرتا

دو شعر

شہر میں ہو کہ دشت میں، رہے گا خوب معرکہ
ہم بھی چراغِ طبع ہیں، وہ بھی ہوا مزاج ہے

اس کی خوشی کے واسطے، ہنستے ہیں کھوکھلی ہنسی
ہم تو قلق پسند ہیں اور وہ اَنا مزاج ہے

دوشعر

شت میں‘ رہے گا خوب معرکہ
ج ہیں‘ وہ بھی ہوا مزاج ہے

ے واسطے‘ ہنستے ہیں کھوکھلی ہنسی
م ہیں اور وہ انا مزاج ہے

متفرقات

اکیلا ہو نہیں سکتا کبھی اپنی اکائی میں
مکین دل نے بخشی ہیں مجھے لاکھوں صفات اپنی

....

بشر کو خاک دے گی، وہ اگر عظمت نہیں دیتی
جو دھرتی اپنے پودوں کو قد و قامت نہیں دیتی

سکتا کبھی اپنی اکائی میں
ی ہیں مجھے لاکھوں صفات اپنی

....

گی وہ اگر عظمت نہیں دیتی
دوں کو قد و قامت نہیں دیتی

سینے میں جس سے شور تھا وہ رُش نکل گیا
اچھا ہوا کہ دل سے وہ مہ وُش نکل گیا

....

جو لے گیا تھا ذہن سے سوچیں نکال کے
پھر لُطف آیا اُس کو سرِعام اُچھال کے

....

پھر اپنے خون کو پانی سمجھ لیا میں نے
فراتِ عشق پہ پہرا تھا اور میں پیاسا تھا

....

وہ لمحہ روز آتا ہے مگر اب تک نہیں آیا
خلا پر خود زمین جائے، زمیں پر خود خلاؔ اُترے

....

خُدائے جستجو! ہر مرحلہ مشکل بنا دینا
سفر اور خواب میں حاصل کو لاحاصل بنا دینا

....

تم کو بتاؤں کیا کہ وہ کیا ساتھ لے گیا
میرا وقار، میری انا ساتھ لے گیا

دکھا دے راستہ لوگوں کو آنے جانے کا
خدائے قلب! منور سرنگ ہو جائے

....

جو ہڈیوں پہ ماس ہے اس کو بھی نوچ لے
جو خون ہے بدن میں، بدن سے نکال دے

....

ہے جن پہ اسے ناز وہ مہرے بھی غلط ہیں
شطرنج زمانہ کا وہ شاطر بھی غلط ہے

....

کوئی دیکھے نہ دیکھے اس نگر میں دیکھتا ہے وہ
مقید فرد کو دیوار و در میں دیکھتا ہے وہ

....

نگر میں کس کی یہ پہچان گم ہوئی لوگوں
یہ کون تھا کہ جو محروم بودوباس ہوا

....

آنکھ میں بینائی پتھرائی گری پلکوں پہ برف
چاند کیا نکلا کہ ہاتھوں سے اشارے چھن گئے

...راستہ لوگوں کو آنے جانے کا
...ب! منور سرنگ ہو جائے

....

...س ہے اس کو بھی نوچ لے
...بدن میں' بدن سے نکال دے

....

...سے ناز وہ مہرے بھی غلط ہیں
... کا وہ شاطر بھی غلط ہے

....

...دیکھے اس نگر میں دیکھتا ہے وہ
...دیوار و در میں دیکھتا ہے وہ

....

...ی یہ پہچان گم ہوئی لوگوں
...کہ جو محروم بودوباس ہوا

....

...ی پتھرائی گری پلکوں پہ برف
...ہاتھوں سے اشارے چھن گئے

جو ہوں آنکھوں سے اوجھل ایسی تقدیریں بھی پڑھتا ہے
وہ چہرے ہی نہیں اندر کی تحریریں بھی پڑھتا ہے

....

زمین دل کی خاصیّت تو ہوتی ہے فلک جیسی
سبھی کو روشنی دیتی ہے یہ ظلمت نہیں دیتی

....

سفیدی ان کے خوں میں میرے بالوں سے زیادہ ہے
مجھے اپنوں میں ساجد کوئی بھی اپنا نہیں لگتا

....

مہنگائی نے پھر گھر میں لگا رکھا ہے بستر
وہ خوف ہے سونا ہے' نہ سونے کے برابر

....

لکھی ہے میں نے اپنے ہاتھ سے تصویر آئندہ
مری اپنی وراثت ہے' قلم اپنی دوات اپنی

....

بلند و پست میں کل شب بلا کی جنگ ہوئی
عروج ہار گیا اور زوال جیت گیا

بیٹیوں کے ساتھ محبت کا ایک منظر

ہنسے جو پھول سے بچے تھکان بھول گئے

اقبال ساجد مرحوم کی اپنی بیگم کے ساتھ ایک یادگار تصویر

اقبال ساجد ایک مشاعرے میں اپنے مداحوں کو آٹوگراف دے رہے ہیں

اقبال ساجد ایک مشاعرے میں اپنے مداحوں کو آٹوگراف دے رہے ہیں

اقبال ساجد مرحوم کی اپنی بیگم کے ساتھ ایک یادگار تصویر

ایک تقریب میں اپنے بیٹوں کے ہمراہ
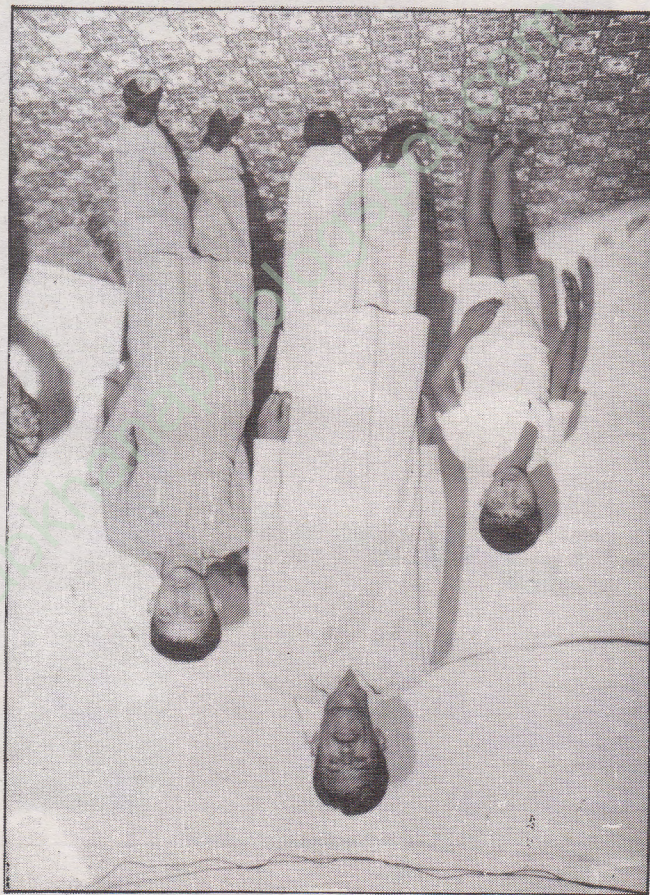
اقبال ساجد جدید غزل گو کہلانے پر بضد رہتا تھا اور اپنے سے زیادہ عمر کے شعراء کی شاعری کو دورِ جدید کے تقاضوں کے حوالے سے غیر ضروری بلکہ بے معنی قرار دیتا تھا۔ دوسری بات کی صحت پر بات ہو سکتی ہے مگر جہاں تک خود اپنے بارے میں اقبال ساجد کے ادّعا کا تعلق ہے' وہ کم و بیش صداقت پر ہی مبنی تھا۔ اس کی غزل کے موضوعات' اس کی منفرد لفظیات' اور اس کا خاص اپنا لہجہ اس کے ثبوت ہیں۔ بے شک اس کے کلام میں جارحیت اور تلخی کے عناصر زیادہ ہیں مگر یہ عناصر غزل کے لئے ممنوع نہیں ہیں۔ آخر یگانہ اور شاد عار کا کلام بھی تو اسی تلخ نوائی کا عکاس ہے مگر کس میں جرأت ہے کہ انہیں بیسویں صدی کے سربر آوردہ غزل گو شعراء کی صف میں سے خارج کرے۔ اقبال ساجد کی غزل نے نہایت ذہین نوجوان غزل گو شعراء کے ہجوم میں اپنی الگ پہچان کو تسلیم کرا لیا تھا اور اس کا سب سے سچا گواہ اس کا کلام ہے۔

جواز جعفری ہم سب کے شکریئے کے مستحق ہیں جنہوں نے اقبال ساجد کے کلام کو یکجا کر کے ضائع ہونے سے بچا لیا۔

احمد ندیم قاسمی

اقبال ساجد جدید اردو غزل کے شعراء میں ایک اہم نام ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کی معاشی اور معاشرتی ابتری کا اثر ایک حسّاس شاعر پر کس طرح اور کس انداز سے ہوتا ہے' اقبال ساجد کا کلام اس کی دردناک مثال ہے۔ اپنے آپ پر طنز' اس ماحول میں گندی سیاست سے بڑے بنے ہوئے اہلِ دانش و شعر پر زہر میں بجھے ہوئے اشعار کی معرفت غم و غصے کا اظہار' کہیں کہیں خود رحمی' کہیں کہیں زخمی انا کی مدافعت' کبھی کبھی خود کو غلط کثرت سے سمجھوتہ کر لینے کی تلقین۔ یہی اقبال ساجد کی شاعری کا حاصل ہے۔ یعنی ایک بگڑے ہوئے نظامِ حیات میں شرفِ انسانی کی بقا کی شاعرانہ خواہش کا بیان۔

اقبال ساجد کے کلام کو یکجا کرنے اور اسے ہمعصر دنیا میں اہمیت دلانے میں ہمارے دوست جواز جعفری نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ جواز جعفری نہ ہوتے تو اس اہم شاعر کا بہت سا کلام اور شخصیت کے بہت سے گوشے ادب پڑھنے والوں کی نظر سے اوجھل رہ جاتے۔

مُنیر نیازی

.... ساجد کی غزل' جدید غزل سے پوری طرح مربوط ہوتے ہوئے بھی اپنی الگ پہچان رکھتی ہے۔ کاش اقبال ساجد کو اتنا وقت مل جاتا کہ وہ اسے اور وُسعت دے سکتا۔ اس کے کلام کا کچھ حصہ بُری طرح بکھرا ہوا ہے۔ کچھ تو ایسا بھی ہے جو دوسروں کے نام پر پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ جواز جعفری مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اقبال ساجد کے مجموعے "اثاثہ" کے بعد ورق ورق اکٹھا کر کے ان کی کُلیات شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اقبال ساجد کی پہچان اس حد تک مکمل ہو جائے گی جتنی کہ موجودہ حالات میں ممکن ہے۔

شہزاد احمد